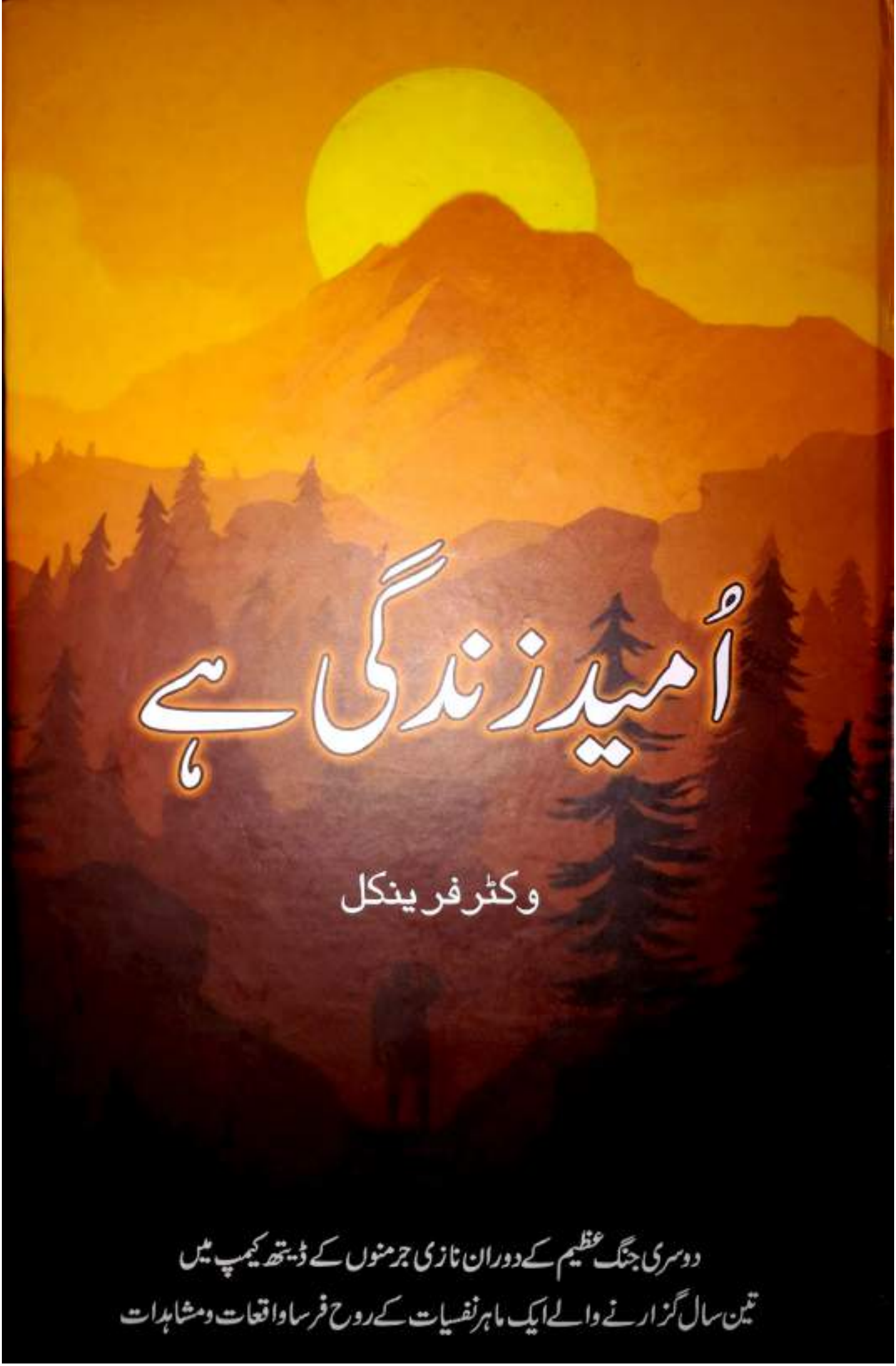

Scanned by CamScanner

اُمید، زندگی ہے

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنوں کے ڈیتھ کیمپ میں
تین سال گزارنے والے ایک ماہر نفسیات کے روح فرسا واقعات و مشاہدات

"Mans Seach for Meaning"

ڈاکٹر وکٹر فرینکل

ترجمہ: سید عرفان احمد

Scanned by CamScanner

جملہ حقوق بہ حق ''قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن'' محفوظ ہیں

زیر اہتمام چوہدری کاشان طارق

طابع حاجی حنیف پرنٹرز

قانونی مشیر چوہان لا ایسوسی ایٹس

اشاعت جولائی 2018ء

قیمت -/300 روپے

ناشر نئی سوچ پبلشرز

42، فرسٹ فلور، ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی اسٹریٹ،

اُردو بازار، لاہور

Scanned by CamScanner

فہرست

عرض مترجم	سید عرفان احمد	7
حراستی کیمپ کے تجربات	وکٹر فرینکل	9
لوگوتھیراپی		91
ڈاکٹر وکٹر فرینکل	حیات اور فلسفہ	95

Scanned by CamScanner

عرضِ مترجم

دوسری جنگ عظیم جو تقریباً چھے برس جاری رہی، اس میں اندازاً ساٹھ سے اَسّی ملین افراد لقمہ اجل بنے۔ ایک جانب اتحادی افواج تھیں جن کی سربراہی امریکا اور برطانیہ کر رہے تھے، جب کہ دوسری جانب صرف دو ملک... جرمنی اور جاپان تھے۔ جرمنی میں ہٹلر کی حکومت تھی اور وہ یہودیوں کا سخت دشمن تھا۔ جرمنی میں بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے، لیکن ہٹلر نے دورانِ جنگ ان پر سخت پابندیاں عائد کر دیں اور انھیں سخت ترین سزائیں دینا شروع کر دیں۔ تاریخ داں بتاتے ہیں کہ ہٹلر نے جو حراستی کیمپ بنائے تھے، اُن میں ایسے گیس چیمبرز بھی تھے جہاں کمزور اور بیمار یہودیوں کو جھونک دیا جاتا تھا۔

ان قیدیوں میں عام افراد سے لے کر ماہرین تک، سبھی شامل تھے جن سے بے گار لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر وکٹر فرینکل ان قیدیوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایک تجربہ کار ماہر نفسیات اور محقق تھا۔ لیکن جب دورانِ جنگ اسے بھی دوسرے یہودیوں کی طرح دور پار قائم ایک حراستی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ چونکہ وہ ایک محقق تھا، اس لیے اس نے اس قدر شدید حالات کے باوجود اپنی حسِ تحقیق کو مرنے نہیں دیا اور وہاں بھی غور و خوض جاری رکھا۔ یہ مختصر سی کتاب اس کے تین سالہ دورِ ابتلا کی مختصر سی آپ بیتی ہے۔

تاہم، یہ آپ بیتی دیگر سے بہت مختلف ہے، کیوں کہ یہ تحریر محض چند واقعات کا مجموعہ نہیں جو کسی پر بیتے ہوں، بلکہ ایک محقق کے ذاتی تجربات اور اس سے اخذ کردہ نتائج بھی دیتی ہے۔ یہ خاصیت بہت کم آپ بیتیوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس کتاب کو ماہرین نے آج تک اپنی تحقیق کا مرکز بنایا ہوا ہے۔

وکٹر فرینکل کی سرگزشت میں آپ کو ادبی چاشنی ملے گی اور نہ جذباتی بھڑک، کیوں کہ وہ مصنف نہیں، محقق ہے اور جو آدمی جو کام کرتا ہے، اس کی تحریر میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ اور ایسا

Scanned by CamScanner

ہی ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود یہ کتاب اپنی پہلی اشاعت (1946ء) کے بعد سے اب تک پوری دنیا میں ایک کروڑ سے زائد کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔

پاکستان میں، کم از کم میری کم علمی کے مطابق، اب تک اس شاہ کار کتاب کو اُردو کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ میرے محترم دوست قاسم علی شاہ صاحب کی خواہش تھی کہ اس کتاب میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے، اس سے اُردو خواں طبقہ محروم نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا اور میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔

میں اگر اپنی بات کروں تو ترجمہ وتدوین کے تیس سالہ دورانیہ میں، اتنی مشقت کسی کتاب کے ترجمے کے دوران مجھے پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ اول تو اس کتاب کی زبان اکیسویں صدی کی مروجہ انگریزی میں نہیں؛ دوم، جو فوجی اور بالخصوص جرمن اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، وہ قطعاً ناقابل فہم ہیں۔ اس لیے اس کتاب کے ترجمے کے دوران میں نے صرف انگریزی لغت ہی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ جرمن الفاظ کے مفہوم ومعانی اور جنگ عظیم دوم کی تاریخ بھی کھنگالنی پڑی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ میری زندگی کے مشکل ترین تراجم میں سے ایک ہے۔ البتہ، میں نے اپنے تمام تر تجربے، تحقیق اور تجسس کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یہ دعوا نہیں کروں گا کہ یہ اکمل ہے۔

باقی، آپ قاری کی حیثیت سے جب یہ ترجمہ پڑھیں تو اپنی غیر جانب دارانہ اور non-judgemental رائے کا اظہار (بذریعہ ای میل) ضرور کیجیے گا۔

میں ایک مرتبہ پھر، اس کاوش کے ضمن میں شاہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں اس معرکہ آرا کتاب کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اللہ کرے، یہ کاوش پاکستانی نسلوں کیلئے سوچ کی تبدیلی کا ذریعہ بن سکے۔ کیوں کہ... سوچ بدلے گی تو ہمارا مستقبل بدلے گا۔

آپ کا

سید عرفان احمد

Scanned by CamScanner

1

حراستی کیمپ کے تجربات

یہ کتاب حقائق اور واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ذاتی تجربات کا بیان ہے۔ وہ ذاتی تجربات جن سے لاکھوں قیدی بار بار گزرے۔ یہ کتاب اس حراستی کیمپ کی اندرونی کہانی ہے جو یہاں سے بچ جانے والے ایک قیدی کی زبانی ہے۔ اس کہانی میں شدید ہول ناکیوں کا بیان نہیں، بلکہ بڑی تعداد کا تعلق چھوٹی چھوٹی اذیتوں سے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، اس میں درج ذیل سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی کہ ''ایک اوسط قیدی کے ذہن میں حراستی کیمپ کی روزمرہ زندگی کیسی تھی؟

زیادہ تر واقعات جو اِس کتاب میں بیان کیے گئے، بڑے اور مشہور حراستی کیمپ کے نہیں ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے اور غیر معروف کیمپوں کی کہانیاں ہیں جہاں حقیقی ظلم کیا گیا۔ یہ عظیم سورماؤں کی اذیت اور اموات کی کہانیاں ہیں اور نہ ''کیپوز'' (=Capos وہ قیدی جو قید خانوں میں بہ طور متولی کام کرتے تھے اور انھیں خاص مراعات حاصل تھیں) اور معروف قیدیوں کے بارے میں ہے۔ اس کہانی کا بہت زیادہ تعلق عظیم سورماؤں پر کیے گئے ظلموں سے بھی نہیں، بلکہ لاپتا اور نامعلوم فوجِ ظفر موج کی قربانیوں اور اموات کے بارے میں اُن کہی کہانیوں سے ہے۔ یہ وہ قیدی تھے جن کی کوئی شناخت نہ تھی اور وہاں موجود کیپوز انھیں حقیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ عام قیدی اکثر بھوکے رہتے یا کھانے کو بہت کم دیا جاتا، جبکہ کیپوز کبھی بھی بھوکے نہ رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض کیپوز اتنے آرام سے تھے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں بھی اتنا آرام سے نہ گزارا ہو۔ وہ قیدیوں پر اکثر محافظوں سے زیادہ سختی

Scanned by CamScanner

کرتے تھے۔ وہ ظلم اور مار پیٹ میں شود استافل (ہٹلر کی خاص فوج) سے بازی لے جاتے۔ دراصل، صرف ایسے قیدیوں کو کیپوز کیلئے منتخب کیا جاتا تھا جن کا کردار اس کام کیلئے بہت مناسب ثابت ہو۔ لہٰذا، اگر وہ مطلوبہ اور متوقع کردار پر پورا نہ اتر پائیں تو انھیں فوری طور پر اس کام سے برخاست کر دیا جاتا تھا۔ وہ بہت جلد شود استافل کی طرح ہو جاتے اور کیمپ کے وارڈن انھیں ان کی ایسی ہی نفسیاتی بنیادوں پر جانچتے تھے۔

باہر کا کوئی فرد کہ جس نے کیمپ کے اندر کا ماحول نہ دیکھا ہو، وہ کیمپ کے اندر کے ماحول کے بارے میں بہ آسانی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ اسے بہت کم پتا چل پاتا کہ یہاں موجود قیدی آپس میں اپنی بقا کیلئے سخت لڑائیاں لڑتے ہیں۔ وہ روٹی کے حصول اور زندگی کی خاطر روزانہ آپس میں بے رحمانہ جنگ کرتے اور یہ بے رحمیت اپنے لیے یا اپنے اچھے دوست کیلئے ہوتی۔

آیئے، ٹرانسپورٹ کو بہ طور مثال لے لیتے ہیں جو سرکاری طور پر مخصوص تعداد میں قیدیوں کو ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ لے جانے کیلئے تھا۔ لیکن اس بات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ گاڑیاں دوسرے کیمپ میں منتقلی کیلئے نہیں تھیں، بلکہ اس میں سوار ہونے والے قیدی مسافروں کی آخری منزل بدنامِ زمانہ ''گیس چیمبرز'' ہوتے تھے۔ ایسے بیمار اور کم زور قیدی جو کام کے قابل نہیں رہتے تھے، انھیں الگ کیا جاتا اور ایک بڑے مرکزی کیمپ بھیج دیا جاتا جہاں گیس چیمبر لگے ہوئے تھے۔ یہ قیدیوں کیلئے شمشان گھاٹ تھا۔ یہ انتخابی عمل اس بات کی علامت تھا کہ اب قیدیوں کے درمیان انتہائی لڑائی ہوگی اور پھر ان میں سے کچھ گاڑی میں بٹھا لیے جائیں گے اور بعض مزید اپنی بقا کی جنگ لڑنے کیلئے یہاں چھوڑ دیے جائیں گے۔

ہر گاڑی میں ایک خاص تعداد میں قیدیوں کو جانا ہوتا تھا۔ قیدیوں کی تعداد اہم نہ تھی، اگرچہ ہر قیدی ایک عدد رکھتا تھا۔ کیمپ میں داخلے کے بعد ہر قیدی سے اس کی تمام چیزوں

Scanned by CamScanner

سمیت تمام دستاویزات لے لی جاتی تھیں۔ اگر چہ ہر قیدی کو یہ موقع ملتا تھا کہ وہ غیر حقیقی نام یا پیشے کا دعوے دار ہو سکے، اور کئی وجہ کی بنا پر بہت سوں نے ایسا کیا۔ لیکن سرکار کو صرف اُن کے ''قیدی نمبر'' سے غرض تھی۔ یہ مخصوص قیدی نمبر اکثر اُن کی جلد پر کسی جگہ گود دیے جاتے تھے اور اُن کی پتلون، جیکٹ یا کوٹ پر ایک جگہ نمبر سی دیا جاتا تھا۔ قید خانے کے داروغہ کو کسی قیدی کو بلانا ہوتا تو وہ صرف اس کا نمبر پکار دیتا، اس سے اس کا نام کبھی نہ پوچھا جاتا۔

کانوائے کی واپسی اس کی دوبارہ روانگی کیلئے ہوتی تھی۔ اس کیلئے کسی وقت کا تعین تھا اور نہ کوئی اَخلاقی جواز۔ ہر شخص صرف ایک خیال کے تحت یہاں موجود تھا: اپنے آپ کو اپنی فیملی کیلئے زندہ رکھنے کی کوشش کرنا کہ جو گھر پر اُس کی منتظر ہے۔ چنانچہ اسی خاطر وہ بلا کسی جھجک کے کسی دوسرے قیدی، کسی دوسرے نمبر کو اپنی جگہ گاڑی میں بھیجنے کی کوشش کرتا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، کیپوز کے انتخاب کا طریقہ بہت ہی بھیانک تھا؛ انتہائی سفاک قیدی اس کام کیلئے منتخب کیے جاتے تھے۔ کیپوز کے انتخاب کے علاوہ کہ جو شودا ستافل کے ذریعے ہوتا تھا، ایک اور خود انتخابی عمل بھی قیدیوں میں تمام وقت جاری رہتا تھا۔ اوسطاً، صرف وہی قیدی زندہ بچ پاتے تھے کہ جن کے بارے میں کیمپ در کیمپ برسوں کی ٹریکنگ اور لڑائیوں کے بعد تمام شکوک ختم ہو جاتے تھے اور ہر لحاظ سے بادیانت مانے جاتے تھے۔ یہ وہ بدقماش اور ظالم لوگ تھے جنھوں نے اپنی جان بچانے کیلئے اپنے دوستوں تک کو ٹھکانے لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ مجھ سمیت... قسمت کی یاوری کہیے یا کرشمہ... جو لوگ واپس آ گئے، وہ جانتے تھے کہ ہم میں سے بہترین لوگ واپس نہیں آ سکے۔

حراستی کیمپ کے بارے میں بہت سے حقائق آج ریکارڈ پر ہیں۔ یہاں میں صرف انھی حقائق کا ذکر کروں گا جو ایک فرد کے تجربات کا حصہ ہیں۔ اس تحریر میں ان تجربات کی نوعیت اور حالت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان تجربات کی فطری نوعیت واضح کی جا سکے۔ جو لوگ کبھی اس کے اندر نہیں گئے، انھیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ

Scanned by CamScanner

کیوں کر بہت کم لوگ ان شدید تجربات سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور اب یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ دن بہت ہی سخت تھے۔ یہ قیدی اکثر کہتے ہیں کہ ''ہم اپنے ان تجربات کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ جو لوگ یہاں قید تھے، انھیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور نہ دوسرے لوگ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اب کیسا محسوس کرتے ہیں۔''

اس موضوع پر ایک منظم و مرتب تحقیق پیش کرنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ اس کیلئے نفسیات کو مخصوص لاتعلقی اور غیر جانب داری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جو ایسے مشاہدات و تجربات سے گزرا ہو، وہ ان سے لاتعلق و غیر جانب دار ہو سکے؟ یہ لاتعلقی اور غیر جانب داری صرف اسی فرد سے ممکن ہے جو اس کیمپ سے باہر ہو، لیکن ایسے حالات کی حقیقت جانچنا کسی باہر والے کیلئے بہت مشکل ہے۔ صرف اندر کا آدمی ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے۔ اس کے اندازے بے غرض ہوں گے اور اس کے تجزیوں میں کوئی مناسبت نہیں ہوگی۔ ایسا ہی ہوگا۔ ایسی کتاب میں کسی تعصب کا نہ ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے ابتدا میں اپنے تئیں غیر جانب داری برتنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس کتاب کا مسودہ تیار کر لیا تو میں نے دیکھا کہ کتاب کی اہمیت آدھی بھی نہیں رہی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس میں اپنی رائے ظاہر کرنے کی جرات کرنی پڑے گی۔

یہ معاملہ میں نے اپنے قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے بارے میں کوئی خشک نظریہ قائم کریں۔ یہ نفسیات کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

میں نے ایک عام قیدی کی حیثیت سے اپنی کہانی بیان کی ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے کیمپ میں چند ہفتوں کے سوا بہ حیثیت ڈاکٹر وہاں کام نہیں کیا۔ میرے چند ساتھی وہاں ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والے کارکنوں کے طور پر کام کر رہے تھے جہاں انتہائی غیر معیاری مرہم پٹی کی جاتی تھی۔ لیکن اس حوالے سے میرا نمبر نہیں آتا تھا اور مجھ سے زیادہ تر ریلوے لائن کے ٹریک کی کھدائی اور بچھائی کا کام ہی کرایا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ

Scanned by CamScanner

مجھ سے سڑک کے نیچے سے پانی کے بہاؤ کیلئے تنہا کسی کی مدد کے بغیر سرنگ کی کھدائی بھی کرائی گئی۔ اس محنت کا نام نہاد انعام یہ ملا کہ مجھے دیگر قیدیوں کے ساتھ ایک تعمیراتی کمپنی کو بہ طور غلام فروخت کر دیا گیا۔ یہ کمپنی کیمپ کی انتظامیہ کو یومیہ فی قیدی کے حساب سے اجرت فراہم کرتی تھی۔ ہر ایک کو پچاس فینگ دیے جاتے تھے جس کے بدلے میں چھے سگرٹیں مل جاتی تھیں۔ اور یہ سگرٹیں بھی اکثر زائد المیعاد ہوا کرتی تھیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں بارہ سگرٹیں لینے کا اہل تھا۔ اس سے اہم بات یہ کہ ان بارہ سگرٹوں کے بدلے بارہ سوپ لیے جاسکتے تھے اور یہ سوپ ہی اکثر بھوک مٹانے کا ذریعہ ہوتے۔

سگرٹ پینے کا استحقاق زیادہ تر 'کیپو' کو تھا جن کے پاس سگرٹ کا ہفتہ واری کوٹا ہوا کرتا تھا؛ یا پھر فورمین کی حیثیت سے کام کرنے والے قیدیوں کو یہ سہولت میسر تھی۔ ان کے علاوہ صرف وہ لوگ اپنی سگرٹ پیا کرتے تھے جو اپنی زندگی کی امید کھو چکے ہیں اور اپنے زندگی کے آخری ایام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایک کامریڈ کو اس انداز سے سگرٹ پیتے ہوئے دیکھا اور ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ مزید کچھ کرنے کی ہمت کھو بیٹھا ہے۔ ایک مرتبہ کوئی یہ امید کھو دیتا تو شاید ہی وہ دوبارہ اسے پاتا۔

اگر تمام قیدیوں کے مشاہدات و تجربات جمع کیے جائیں تو ان میں تین طرح کے ذہنی ردِعمل سامنے آتے ہیں۔ اول، اُن کے کیمپ میں داخلے کا دَور، کیمپ میں معمولات کے مطابق وقت گزارنے کا دور، اور آزادی پانے کا دَور۔

پہلے دَور کی علامات بہت ہی خطرناک ہیں۔ بعض اوقات یہ علامات کیمپ کے دوسرے دورانیہ تک چلتی رہتی تھیں۔ میں اس سلسلے میں، اپنی مثال دیتا ہوں۔

پندرہ سو افراد نے کئی دن رات کا طویل سفر بذریعہ ٹرین کیا۔ ہر بوگی میں اَسّی افراد سوار تھے۔ ہر مسافر اپنے ہی سامان پر پڑ کر سو رہتا۔ ہر ایک کو یہ توقع تھی کہ اسے گولا بارود کی کسی فیکٹری میں بھیج دیا جائے گا جہاں اس سے جبری مزدوری کا کام لیا جائے گا۔ ہمیں یہ

Scanned by CamScanner

بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم سیلیسیا پہنچ چکے ہیں یا پہلے سے پولینڈ میں ہیں۔ٹرین کے انجن کی ویسل اتنی درد بھری تھی کہ یوں لگتا تھا، وہ مجبور و بے کس ہوا اور اپنی موت کو آواز دیتی ہو۔پھر ہوا یوں کہ یہ ٹرین ایک مرکزی اسٹیشن پر جا ٹھہری۔کسی پریشان خیال مسافر نے یک دم ایک آواز لگائی، ''وہ دیکھو، آشویٹز لکھا ہوا ہے۔''اس لمحے ہر ایک کا دل گویا رک سا گیا۔

آشویٹز کا نام دہشت کی علامت تھا: گیس چیمبرز، شمشان گھاٹ، قتل گاہ۔ٹرین بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔یوں لگتا تھا کہ مسافروں کو اس خطرناک جگہ کی دہشت کا زیادہ سے زیادہ احساس دلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جوں جوں سورج طلوع ہو رہا تھا کیمپ رفتہ رفتہ واضح ہوتا جارہا تھا۔دھاتی تاروں سے تیار کی گئی طویل باڑیں، بلند ٹاور جہاں سے پورے کیمپ کو دیکھا جاتا، دیوہیکل سرچ لائٹس اور خستہ حال انسانوں کی طویل قطاریں۔یہ تمام لوگ ویران راستے پر چل رہے تھے، مگر انھیں اپنی منزل کا پتا نہیں تھا۔ہاں، البتہ گاہے گاہے کسی کی بے رحمانہ آواز یا سیٹی ضرور سنائی دیتی جو کسی حکم کیلئے ہوتی۔لیکن، ہمیں اس کا مطلب معلوم نہیں تھا۔مجھے لگ رہا تھا کہ یہ تمام لوگ پھانسی گھاٹ پر لے جائے جارہے ہیں۔میں بہت خوف زدہ تھا۔لیکن، رفتہ رفتہ یہ خوف ہلکا ہو گیا، کیوں کہ ہم نے اسے کہیں زیادہ شدید خوف ناک شے دیکھ لی تھی۔

ہمیں بہ ظاہر ایک اسٹیشن پر منتقل کر دیا گیا۔خاموشی تھی جو کرخت آواز میں ایک حکم سے ٹوٹی۔یہ آوازیں ہمیں پورے کیمپ میں بار بار سننے کو ملتی تھیں۔یہ آوازیں اکثر قیدی کی آخری چیخ کی مانند ہوا کرتی تھیں۔گویا، ایک آدمی کو بار بار موت دی جارہی ہو اور وہ گلا پھاڑ کر چلا رہا ہو۔گاڑی کا دروازہ تھوڑا سا کھلتا اور چند قیدی اس میں دھکیل دیے جاتے۔وہ پٹی دار لباس پہنے ہوتے۔اُن کے سر منڈھے ہوتے لیکن وہ کھاتے پیتے دکھائی دیتے تھے۔وہ ہر ممکنہ یورپی زبان بولتے۔وہ کبھی کبھار کچھ مذاق بھی کر لیتے، جو اس ماحول میں بہت ہی مضحکہ خیز معلوم دیتا۔جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے، اسی طرح میری منہنی سی امید پرستی

Scanned by CamScanner

مجھے اس خیال اور احساس کے ساتھ جینے کا حوصلہ دیتی کہ یہ قیدی بالکل درست دکھائی دیتے ہیں، یہ اچھی حالت میں دکھائی دیتے ہیں، حتیٰ کہ ہنستے بھی ہیں۔

نفسیات میں یہ کیفیت ایک قسم کا فریب کہلاتی ہے جس میں ایک آدمی کہ جسے سزائے موت دی جانی ہے، اس فریب میں شدید مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھانسی کے آخری لمحات میں اس کی پھانسی ملتوی کر دی جائے گی۔ ہم بھی اسی فریب میں مبتلا تھے کہ آخری لمحات میں ہمارے ساتھ بہت برا نہیں ہوگا، بلکہ سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔ قیدیوں کی سرخ ٹھوڑیوں اور گول چہروں کو دیکھ کر بہت ہی طمانیت ہوتی۔

آشویٹز جنگ کے آخری دنوں میں یورپ میں ایک بہت ہی اجنبی جگہ رہی تھی۔ وہاں سونے، چاندی، پلاٹینم اور ہیروں کے منفرد خزانے تھے جو نہ صرف وہاں کے گوداموں میں موجود تھے، بلکہ شود استافل کے پاس بھی ہوتے تھے۔

پندرہ سو قیدیوں کو ایسی جگہ رکھا گیا تھا جو اصلاً زیادہ سے زیادہ دو سو افراد کیلئے تیار کی گئی تھی۔ ہم سب تھکے ہوئے اور بھوکے تھے۔ اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ آرام سے اکڑوں بیٹھ سکیں... تو پھر کمر کیسے سیدھی کی جا سکتی تھی۔ صرف پانچ اونس روٹی کا ایک ٹکڑا گزشتہ چار دن میں ہماری کل غذا تھی۔ اگرچہ میں نے سنا تھا کہ قیدیوں کے انچارجوں کو پلاٹینم اور ہیرے سے بنی ٹائی پن انعام میں دی جاتی ہے اور وہ اس کے بدلے زیادہ تر شراب خریدنا پسند کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنے جرمن مارکس یا پلاٹینم کے ٹائی پن شراب کی خریداری کیلئے درکار ہوتے تھے، لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ قیدیوں کو بہ ہر کیف، شراب کی طلب ضرور ہوتی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں کون بھلا کسی کو نشہ کرنے پر لعن طعن کرتا۔ قیدیوں کا ایک گروپ وہ تھا جنھیں نازی فوجی وافر مقدار میں شراب فراہم کرتے تھے۔ بعض مردوں کی ذمے داری گیس چیمبرز اور پھانسی گھاٹ پر ہوتی تھی۔ انھیں یہ بات خوب معلوم تھی کہ ایک دن جلاد کی جبری ڈیوٹی ان سے لے لی جائے گی اور انھیں کوئی اور پھانسی دے رہا ہوگا۔

Scanned by CamScanner

تقریباً ہر ایک اس فریب میں تھا کہ ایک دن اسے چھوٹ مل جائے گی اور سب کچھ درست ہو جائے گا۔ ہم یہ تمام منظر سمجھنے اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ اپنا اپنا سامان ٹرین ہی میں چھوڑ دیں اور بوگیوں سے چھلانگ لگا کر دو قطاروں میں کھڑے ہو جائیں... ایک قطار میں مرد اور دوسری قطار میں عورتیں... تاکہ شوداستافل کے اعلا افسران اندراج کر سکیں۔ خوش قسمتی سے میں اپنا تھیلا اپنے کوٹ کے نیچے چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں جس قطار میں تھا، اس کے تمام مردوں کا اندراج ہوا۔ مجھے یہ بات گزشتہ تجربے سے معلوم تھی کہ اگر کسی افسر کو میرے تھیلے کے بارے میں پتا چل گیا تو یہ میرے لیے بہت خطرناک ہوگا۔ کم از کم وہ مجھے مارے گا ضرور۔ میں جبلی طور پر، افسر کی طرف یوں بڑھنے لگا کہ اس نے میرے وزن کی طرف دھیان نہ دیا۔ میں اس کے رُوبہ رُو تھا۔ وہ ایک طویل قامت آدمی تھا، ستواں دکھائی دیتا تھا اور اپنے چٹے یونیفارم میں خوب فٹ تھا۔ کیا ہی حسین کنٹراسٹ تھا کہ وہ اتنے صاف کپڑوں میں ملبوس اور میں طویل سفر کے بعد گندے اور مٹی میں اٹے ہوئے لباس میں تھا۔ اس کا رویہ بہت ہی بے پروایانہ اور غیر محتاط تھا۔ اپنی دائیں کہنی اپنے بائیں ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اوپر کی جانب تھا اور بہت ہی آرام سے وہ اپنی انگشت شہادت سے دائیں بائیں اشارہ کر رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی انگلی کی دائیں بائیں معمولی سی حرکت کتنے خطرناک معنی رکھتی ہے۔ اب وہ بائیں جانب کہیں زیادہ اشارے کر رہا تھا۔

اب میری باری تھی۔ کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ دائیں جانب کا مطلب ہے کہ فلاں مرد کو کام پر بھیجو جب کہ بائیں کی طرف اشارہ بتاتا ہے کہ فلاں آدمی بیمار ہے، لہٰذا اسے خاص کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ میں منتظر تھا کہ کب میری باری آتی ہے۔ میرے پاس جو تھیلا تھا، اس کے وزن کی وجہ سے میرا بدن کچھ بائیں جانب کو جھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باجود میں نے سیدھا چلنے کی کوشش کی۔ شوداستافل کے فوجی نے مجھے دیکھا، کچھ ہچکچایا

Scanned by CamScanner

اور پھر اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور اس نے میرے کندھے آہستہ سے سیدھے کیے یہاں تک کہ میں سیدھا ہو گیا۔ اور پھر، میں ایک طرف کو چلا گیا۔

انگلیوں کی حرکت کا مفہوم ہمیں شام کو پتا چلا۔ یہ ہمارے زندگی یا موت کے فیصلے کا پہلا انتخاب تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والوں کی اکثریت، تقریباً نوے فیصد کیلئے موت کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ انھیں اگلے چند گھنٹے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جو لوگ بچ گئے، انھیں اسٹیشن سے سیدھا شمشان لایا گیا۔ جب مجھے اس عمارت میں لایا گیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے دروازوں پر ''غسل'' کا لفظ کئی یورپی زبانوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں داخلے کے بعد ہر قیدی کو ایک صابن دے دیا جاتا تھا۔ اس سے آگے کیا ہوتا تھا، میں ان حالات سے گزرا ہوں تو مجھے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دہشت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

گاڑی میں آنے والوں میں سے ہم چند ہی بچے تھے، شام کو یہاں کی حقیقت آشکار ہوئی۔ یہاں جو لوگ پہلے سے قیدی تھے، ان سے میں نے اپنے ساتھیوں اور ہم سفروں کے بارے میں پوچھا تو کچھ درج ذیل باتیں پتا چلیں۔

''کیا اسے بائیں جانب بھیجا گیا تھا؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر تم اسے یہاں دیکھ سکو گے۔'' مجھے بتایا گیا۔

''کہاں؟'' ایک ہاتھ اٹھا اور اس نے چند سو گز کے فاصلے پر موجود ایک چمنی کی طرف اشارہ کیا جس میں سے دھواں اٹھ کر فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ یہ دھواں کچھ دیر میں دھویں کے بدشگون بادل میں تحلیل ہو رہا تھا۔ پھر وہ گویا ہوا:

''اس دھویں کے ساتھ تمہارا دوست جنت کی طرف پرواز کر رہا ہے۔''

Scanned by CamScanner

اس کے باجود میں یہ بات اس وقت تک نہ سمجھ پایا جب تک یہ حقیقت مجھے سادہ الفاظ میں نہ سمجھائی گئی۔

لیکن، یہ بات میں آپ کو اس کی جانب سے بتا رہا ہوں۔ ایک نفسیات داں کے نقطہ نظر سے عرض کروں تو اسٹیشن پر صبح طلوعِ آفتاب سے لے کر رات کو کیمپ میں پہلی رات کے آرام تک ایک طویل فاصلہ ہے جو ہم نے طے کیا تھا۔

شودا ستافل نے جو اچھی طرح بندوقوں سے لیس تھے، ہمیں اسٹیشن سے کیمپ تک بھاگتے ہوئے پہنچنے پر مجبور کیا۔ ان کے پاس بجلی دوڑتی تاریں بھی تھیں جنھیں وہ اسٹیشن سے لے کر کیمپ تک استعمال کرتے چلے آئے تھے۔ جو لوگ پہلے انتخاب سے بچ نکلے تھے، واقعی ایک حقیقی غسل کا تجربہ کر چکے تھے۔ ہم دوبارہ اپنے اس فریب کی توثیق چاہتے تھے کہ ہم اس مرتبہ بھی موت سے بچ جائیں گے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں شودا ستافل کے دو بہت ہی حسین فوجی نظر آئے۔ جلد ہی ہمیں اس کا سبب معلوم ہو گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اس لیے مسکرا رہے تھے کہ اُنھوں نے ہماری کلائیوں پر بندھی گھڑیاں دیکھ لی تھیں اور ان کی معنی خیز مسکراہٹ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی گھڑیاں اُن کے حوالے کر دیں۔ کہیں ہمیں اپنا تمام سامان تو اُن کے حوالے نہیں کرنا پڑے گا، اور کیوں ان لوگوں کے پاس گھڑی نہیں ہے؟ ہو سکتا ہے، وہ ہمارے ساتھ کوئی بھلائی کر ڈالیں۔

ہم ایک دالان میں ایک چھجے کے نیچے انتظار کرتے رہے۔ یہ دالان آگے چیمبر میں کھلتا تھا۔ اسی اثنا میں شودا ستافل ظاہر ہوئے اور انھوں نے کچھ کمبل وہاں پھیلا دیے تا کہ ہم لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، بہ شمول گھڑیوں اور زیورات کے، اس میں ڈال دیں۔ اب بھی ہم میں ایسے بھولے بھالے قیدی تھے جو یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا وہ اپنی شادی کی انگوٹھی یا کوئی لاکٹ وغیرہ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا کہ یہاں سب سے سب کچھ لے لیا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

میں نے ایک پرانے قیدی کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی طرف گیا اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں موجود ایک کاغذ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ایک سائنسی کتاب کا مسودہ ہے۔ مجھے معلوم ہے، آپ کیا کہیں گے؛ لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی مدد خود نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ مسودہ ہر حال میں محفوظ کرنا ہے۔ اس میں میری زندگی بھر کی محنت ہے۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟

جی ہاں، وہ میری بات سمجھنا شروع کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی... پہلے افسوس بھری، پھر تضحیک آمیز اور پھر خوشی سے بھرپور، حتیٰ کہ میرے سوال کے جواب میں اس کی زبان سے غلیظ گالی ادا ہوئی۔ اسی لمحے مجھے وہ سادہ سچ دکھائی دیا جس نے میری گزشتہ پوری زندگی کو ملیامیٹ کر ڈالا۔

اچانک میرے تمام ساتھیوں کے درمیان ایک ہلچل مچ گئی جو پیلے، خوف زدہ چہروں کے ساتھ بے یار و مددگار کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے دوبارہ بھاری بھرکم آواز میں ایک حکم سنا۔ پھر ہمیں مکے مارتے ہوئے اس عمارت کے اگلے حصے میں لے جایا گیا۔ وہاں شودا استافل کا ایک آدمی کھڑا ہوا تھا جو اُس وقت تک ہمارا انتظار کرتا رہا جب تک تمام لوگ وہاں نہیں پہنچ گئے۔ پھر اس نے ہم سے کہا کہ میں تمہیں دو منٹ دے رہا ہوں اور اپنی گھڑی سے یہ دو منٹ گنوں گا۔ ان دو منٹوں میں تم لوگوں نے اپنے تمام کپڑے اتار کر فرش پر ڈال دینے ہیں۔ سوائے جوتوں اور بیلٹ کے تمہارے بدن پر کچھ نہ ہو۔ میں گنتی گننا شروع کر رہا ہوں۔"

غیر ارادی ہچکچاہٹ کے ساتھ لوگوں نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔ جب وقت کم رہ گیا تو کرب بڑھ گیا اور ہم نے اپنے زیر جامہ بہت ہی بے ڈھنگے انداز سے اتارے۔ پھر ہم نے کوڑے کی پہلی آواز سنی؛ قیدیوں کے ننگے جسموں پر چمڑے کے پٹے برسائے جا رہے تھے۔ اگلے مرحلے پر ہمیں ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں نہ صرف

Scanned by CamScanner

ہمارے سر کے بال بلکہ پورے جسم کے بال مونڈ دیے گئے۔ پھر ہم شاور پر گئے جہاں ہم دوبارہ قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم بہ مشکل ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے۔ لیکن، نہانے کا یہ عمل کوئی آرام دہ نہیں تھا۔ بعض لوگوں کو یہ لگ رہا تھا کہ اُن کے بدن پر پڑنے والا پانی دراصل ان جسم کی چربی بھی ساتھ بہا کر لے رہا ہے۔

جب ہم شاور کا انتظار کر رہے تھے، ہماری عریانیت نے ہمیں یہ باور کرایا کہ ہمارے پاس اپنے چھپانے کو کچھ بھی نہیں تھا... ہمارے پاس جو کچھ تھا، وہ بس ہمارا عریاں وجود تھا۔ ہماری سابقہ زندگیوں کے ساتھ اگر کوئی تعلق تھا تو صرف ہمارے مادی وجود کا تھا۔ میرے پاس صرف ایک چشمہ اور ایک بیلٹ تھے۔ بیلٹ بھی بعد میں ایک روٹی کے عوض مجھے دینی پڑ گئی۔ شام کو سینئر قیدی جو ہمارے کمرے کا انچارج تھا، آیا۔ اس نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ایک تقریر کی جس میں اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اگر کسی نے اپنی بیلٹ میں کوئی رقم یا قیمتی پتھر چھپایا تو اسے وہ خود لٹکائے گا۔ اس نے بڑے فخر سے یہ بیان کیا کہ چونکہ وہ سینئر اور پرانا قیدی ہے، اس لیے یہاں کا قانون اسے ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

جہاں تک ہمارے جوتوں کا معاملہ ہے، وہ بھی سادہ نہیں تھا۔ اگرچہ ہمیں اپنے جوتے پہننے کی اجازت دی گئی، لیکن جن لوگوں کے پاس قیمتی جوتے تھے، ان کے یہ جوتے اتروا کر انھیں دوسرے جوتے پہننے کو دے دیے جاتے تھے جو انھیں پورے آتے ہی نہیں تھے۔ اصلی مصیبت اُن لوگوں کیلئے تھی جو فوجی جوتے پہنے ہوئے تھے اور انھیں سینئر قیدیوں نے ڈیوڑھی میں یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ انھیں اوپر سے کاٹ کر چھوٹا کریں اور صابن لگا کر کٹی ہوئی جگہ کو برابر کریں۔ یہ جرم کرنے والے تمام مجرموں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا جاتا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دوبارہ کثرت سے کوڑوں کی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں کے ساتھ درد سے کلبلاتے ہوئے مردوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔

یوں، ہماری خود فریبیاں جن میں ہم اب تک مبتلا تھے، ایک ایک کر کے ختم ہوتی

Scanned by CamScanner

گئیں۔ اور پھر، ایک حیرت انگیز بات ہوئی... ہم میں سے چند پر ''ظالمانہ حس مزاح'' طاری ہوگئی۔ ہمیں پتا چل چکا تھا کہ ہمارے پاس اپنی مضحکہ خیز عریاں زندگیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب شاور چلنا شروع ہوا تو ہم نے اپنے آپ سے اور دوسرے ساتھیوں سے مذاق کرنے کی از حد کوشش کی۔ بہ ہر حال، اصلی پانی کی بوچھاڑ جو ہو رہی تھی۔

اس عجیب طرز کے حس مزاح کے علاوہ ایک اور احساس نے ہمیں جکڑ لیا: تجسس۔ میں اس طرح کے تجسس کا احساس پہلے تجربہ کر چکا تھا۔ یہ احساس تب آتا ہے کہ جب عجیب حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جب میں ایک مرتبہ درخت پر چڑھنے کے بعد حادثے کا شکار ہوا تھا تو اس نازک لمحے ایسے ہی تجسس کا احساس ہوا تھا؛ یہ تجسس کہ آیا میں اس سے زندہ بچ نکلوں گا یا میرے دماغ یا جسم کے کسی اور حصے کو گزند پہنچے گی۔

یہ عجیب تجسس آشویٹز میں بھی کچھ نمایاں ہوا تھا اور اس نے ذہن کو اپنے اردگرد ماحول سے لاتعلق کر دیا تھا۔ اسے ایک قسم کی مقصدیت سے متعلق قرار دیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ کیفیت بچاؤ کیلئے ایک ذہنی کیفیت تھی۔ ہم یہ جاننے کیلئے پریشان تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اگلے چند روز میں ہمارے تجسس میں حیرانی بھی شامل ہوگئی؛ حیرانی اس بات کی کہ مکمل برہنہ ہونے، گیلے بدن ہونے اور خزاں کی ہوا لگنے کے باوجود ہمیں نزلہ نہیں ہوا۔

نو آوردوں کیلئے یہاں بہت سی حیرانیاں تھیں۔ ہمارے اندر موجود طب یا میڈیکل سے تعلق رکھنے والوں نے سب سے پہلے یہ سیکھا کہ ''نصابی کتابیں جھوٹ بولتی ہیں!'' ان میں سے ایک جھوٹ یہ ہے کہ مخصوص گھنٹوں کی نیند کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ بالکل غلط! مجھے یہ پتا چل چکا تھا کہ یہاں چند کام ایسے ہیں جو میں نہیں کر سکتا: مثال کے طور پر، میں فلاں شے کے بغیر سو نہیں سکتا یا فلاں شے یا فرد کے بغیر جی نہیں سکتا۔ آشویٹز میں پہلی رات ہم ایسے بستروں پر سوئے تھے جو اوپر نیچے بنے ہوئے تھے۔ بستر کی ہر منزل ساڑھے

Scanned by CamScanner

چھے سے آٹھ فیٹ طویل تھی اور ہر بستر پر نو مرد سوتے تھے۔ ان تمام مردوں کیلئے صرف دو کمبل دست یاب تھے۔ ظاہر ہے، ہم صرف ایک ہی کروٹ لیٹ سکتے تھے، کیوں کہ ہم ایک دوسرے پر گویا کہ لدے ہوئے تھے۔ تاہم، سخت سردی کی وجہ سے یہ اچھا بھی تھا۔

چونکہ ہم سے جوتے نہیں لیے گئے تھے، اس لیے بعض لوگوں نے اپنے جوتوں کو اپنے سرہانے کے طور پر استعمال کیا تھا، اور انھیں یہ احساس بھی نہ رہا کہ اُن کے جوتے کیچڑ سے اٹے ہوئے ہیں۔ دوسروں نے اپنے بازوؤں کے ذریعے اپنے سر کو سہارا دیا ہوا تھا۔ جب نیند آئی اور ہم کچھ دیر کیلئے بے ہوشی میں چلے گئے تو چند گھنٹے کیلئے درد سے چھٹکارا ملا۔

میں چند ایسی ہی حیرانیاں آپ سے بیان کرنا چاہوں گا کہ جن میں بہت زیادہ جرات کا اظہار کرنا پڑا۔ ہم اپنے دانت صاف کرنے سے قاصر تھے۔ یہ اور وٹامن کی شدید کمی کے باوجود ہمارے مسوڑے پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند تھے۔ ہمیں ایک ہی شرٹ تقریباً آدھے سال تک پہننی پڑتی تھی، یہاں تک کہ اس شرٹ کو پہچاننا ہی مشکل ہو جائے۔ کئی دن تک ہم اپنے ہاتھ پورے تو کیا، ان کا کچھ حصہ بھی دھونے سے قاصر تھے۔ کیوں کہ سخت سردی کی وجہ سے پانی پائپوں میں جمع ہوا تھا۔ اور چونکہ مٹی میں کام کرنے کی وجہ سے زخم مٹی سے بھرے ہوئے تھے، اس لیے اُن میں پیپ نہیں پڑی تھی۔ البتہ پالا مار (فراسٹ بائٹ) ضرور ہو سکتا تھا۔

دوستووسکی نے کہا تھا کہ انسان ہر شے سے مانوس ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے تو ہم کہتے، ''ہاں، ایک آدمی ہر شے سے مانوس ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نہ پوچھو کہ کیسے؟'' ہماری نفسیات پر ہونے والی تحقیقات ہمیں یہاں تک لے کر نہیں گئیں؛ اور نہ ہم بہ حیثیت قیدی، یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم ابھی تک اپنے نفسیاتی ردِعمل کے پہلے مرحلے ہی میں تھے۔

خودکشی کا خیال تقریباً ہر ایک کو آیا تھا، خواہ ایک لمحے ہی کیلئے سہی۔ حالات کی بے

Scanned by CamScanner

چارگی، ہر روز اور ہر گھنٹے موت کا مستقل خوف اور دوسروں کی موت کو قریب سے دیکھنا، ایسے اسباب ہیں جن کے باعث آدمی کو خودکشی کا خیال آتا ہے۔ مجھ سے پوچھئے تو میں خودکشی کا تہیہ کر چکا تھا کیمپ میں خودکشی کا سب سے آسان اور مقبول طریقہ یہ تھا کہ اس کے اردگرد بجلی سے گرم شدہ جو تار لگی ہے، اسے چھولیا جائے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ البتہ، اس خودکشی کے ذیل میں ایک نکتہ تھا۔ یہاں کے قیدیوں کے بچنے کے اوسط امکانات بہت کم تھے۔ بہت کم قیدی تمام انتخابات سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے۔ پہلے مرحلے کے صدمے میں، آشویٹز کا قیدی موت سے خوف زدہ نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ گیس چیمبر کی دہشت بھی چند روز سے زیادہ باقی نہیں رہتی تھی۔ بالآخر، یہ تمام مراحل اسے خودکشی کرنے سے روک دیتے تھے۔

میرے اُن دوستوں نے جو مجھ سے بعد میں ملے، مجھے بتایا کہ میں اُن لوگوں میں تھا جو یہاں داخلے کے صدمے پر بہت زیادہ مایوس نہیں تھے۔ حتیٰ کہ جب آشویٹز میں پہلی رات کے بعد صبح آئی تو میں بس مسکرایا۔ اپنے بلاک کو نہ چھوڑنے کے سخت حکم کے باوجود میرا ایک قلیق جو کئی ہفتے پہلے یہاں آچکا تھا، چھپتا چھپاتا میرے پاس آیا۔ وہ ہمیں اطمینان دلانا اور چند بنیادی باتیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا دبلا ہو چکا تھا کہ پہلے تو ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ چند مزاحیہ باتیں کرنے اور بے پروایانہ رویے کے ساتھ اس نے جلدی جلدی ہمیں کچھ ٹوٹکے بتائے: ڈرنا نہیں! انتخاب سے گھبرانا نہیں! شودا ستافل کا میڈیکل چیف ڈاکٹر ایم ڈاکٹروں کیلئے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ (میرے دوست کی یہ بات غلط تھی۔ اس نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک اور ڈاکٹر اور ساٹھ سالہ بوڑھے نے مجھے یہ بتایا کہ اس کے بیٹے کو گیس چیمبر میں جھونکنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی رہائی کی درخواست ڈاکٹر ایم سے کی، لیکن اس نے یہ درخواست مسترد کر دی۔)

البتہ اس نے چند اور باتیں بھی کہیں، ''روزانہ شیو کرو، خواہ تمہیں شیشے کا ٹکڑا ہی کیوں

ناں استعمال کرنا پڑے... خواہ تمہیں اس کیلئے روٹی کا آخری ٹکڑا ہی کیوں ناں دینا پڑے۔ یوں، تم نوجوان دکھائی دو گے اور تمہارے چہرے پر سرخی نظر آئے گی۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو اس کا صرف ایک راستہ ہے: کام کیلئے تن درست دکھائی دو۔ فرض کرو، اگر تمہاری ایڑھی میں دانہ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے تمہیں لنگڑا کر چلنا پڑ رہا ہے اور شودا استافل نے یہ دانہ دیکھ لیا تو یقینی بات ہے کہ وہ تمہیں ایک طرف کر دے گا اور اگلے دن تمہیں یقینی طور پر گیس میں ڈال دیا جائے گا۔ جو آدمی جسمانی لحاظ سے اس قابل نہیں کہ کام کا بوجھ برداشت کر سکے، اسے جلد یا بدیر... اور زیادہ تر فوراً گیس چیمبر میں لے جایا جائے گا۔ لہٰذا، یہ بات یاد رکھو کہ شیو کرو، سیدھے کھڑے ہو اور چست لوگوں کی طرح چلو۔ تب، تمہیں گیس چیمبر سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی ہوئے ہیں تو تم سیدھے کھڑے ہو، تمہیں گیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا، "میرے خیال میں، میں نے جو اتنی بے تکلفی سے بات کی ہے، تم اس کا برا نہیں مانو گے۔"

میں مسکرایا۔ میں اب یہ بات تسلیم کر چکا تھا کہ میری جگہ پر ہر فرد ویسا ہی کرتا، جیسا میں نے کیا ہے۔

غالباً گوتھولڈ لیسنگ نے کہا تھا، "کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے اسباب کھونے کا سبب بنتی ہیں یا پھر آپ کے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔" خلافِ معمول (ابنارمل) حالات میں خلافِ معمول ردِ عمل ہی معمول کا برتاؤ ہوتا ہے۔ چند سائیکاٹرسٹ یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ ایک خلافِ معمول صورتِ حال میں اس کا خلافِ معمول ردِ عمل، مثلاً سیاسی پناہ کی درخواست، اس کی معمولیت کی مناسبت سے خلافِ معمول ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی کا کنسنٹریشن کیمپ میں داخلے پر ردِ عمل اس کی خلافِ معمول ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن تجزیہ یہ ہے کہ اس کا یہ برتاؤ معمول کے مطابق ہے، خاص کر مذکورہ صورتِ حال

Scanned by CamScanner

میں۔ یہ ردِعمل، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چند روز میں بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ قیدی پہلے مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جاتے ہیں؛ اس مرحلے پر وہ ایک قسم کی جذباتی موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور سنگ دلی کا شکار ہوتے ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے ردِعمل سے قطع نظر، نئے آنے والے قیدی دیگر انتہائی تکلیف دہ جذبات سے گزرتے۔ سب سے پہلے تو ان کی اپنے گھر اور اہل خانہ کی یاد جو انھیں شدید بے تاب کرتی۔ پھر اُن میں اپنے اردگرد ماحول سے انتہائی نفرت پیدا ہوتی۔

زیادہ تر قیدی پھٹے پرانے یونیفارم پہنے ہوتے جنھیں دیکھنے پر یوں لگتا کہ جیسے کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کیلئے باگڑ بلا کھڑا ہے۔ رہائشی خانوں کے درمیان گندگی کے ڈھیر تھے جن کی جتنی زیادہ صفائی کی جاتی، اتنا زیادہ وہاں ڈھیر لگ جاتے۔ البتہ بیت الخلاؤں کی صفائی کرنے والے افراد جو اکثر نووارد ہوتے تھے، وہ اس جگہ کی صفائی خوشی خوشی کرتے تھے۔ فضلہ ٹھکانے لگانے کیلئے جب دور میدانوں میں لے جایا جاتا اور ناہموار جگہوں سے گاڑی گزرتی تو اکثر فضلہ سمیٹنے والے افراد کے چہرے پر بھی اچھل کر آ گرتا۔ اگر کسی قیدی کے چہرے سے کسی قسم کی کراہت کا تاثر ابھرتا یا وہ اپنے اوپر سے اسے ہٹانے کی کوشش کرتا تو کیپو کی طرف سے دھکا دیا جاتا۔ یوں، معمولی سے ردِعمل پر بھی شدید اور فوری مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔

شروع میں اگر کوئی قیدی دوسرے قیدیوں کو سزا پاتے ہوئے دیکھتا کہ انھیں گھٹنوں دلدل میں کھڑا کیا جا رہا ہے اور مکوں اور لاتوں سے اُن کی تواضع کی جا رہی ہے تو وہ اس منظر کو برداشت نہ کر پاتا۔ دنوں یا ہفتوں بعد یہ چیزیں بدل جاتیں۔

صبح سویرے، منھ اندھیرے قیدی گیٹ کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور مارچ کیلئے تیار ہوتے۔ ایک دن ایک قیدی کی چیخ سنی گئی۔ دیکھا گیا کہ ایک بیمار قیدی کو زدوکوب کر کے گرا دیا گیا ہے۔ وہ کھڑا ہوا تو اسے دوبارہ مارتے ہوئے گرا دیا گیا۔ کیوں؟ اسے

Scanned by CamScanner

بخار تھا، لیکن بخار سے زیادہ اس نے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے نامناسب وقت پر اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتایا تھا۔ گویا، اس نے اپنی ذمے داریوں سے بچنے کی کوشش کی تھی... اور اس جرم کی پاداش میں اسے یہ سزا دی گئی۔

جو قیدی اپنے نفسیاتی ردِعمل کے دوسرے مرحلے سے گزر چکا تھا، اس نے اپنی آنکھیں مزید نہیں ہٹائیں۔ اس کے بعد سے اس کے احساسات واضح تھے اور وہ بے حس و حرکت دیکھتا رہا۔ ایک اور مثال ایک فوجی ہسپتال میں انتظار کی ہے۔ مریض قیدی کو انتظار تھا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھا دے تاکہ بخار یا زخم کے باعث اسے دو دن کام میں کچھ رعایت مل جائے۔ وہ ابھی اپنی باری کے انتظار ہی میں تھا کہ ایک بارہ سالہ لڑکے کو لایا گیا جسے جبراً کئی گھنٹے سخت برف میں کام کرنے کیلئے کھڑا رکھا گیا تھا۔ یخ بستہ سردی میں ننگے پاؤں کھڑے رہنے سے اس کے انگوٹھے پالا مار کا شکار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک ایک کر کے اس کے ناسور دُور کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں نفرت، دہشت اور بے رحمی وہ جذبات تھے جنھیں ہمارے ساتھی تماشائی اب مزید محسوس نہیں کرتے تھے۔ چند روز کیمپ میں گزارنے کے بعد مرنے والوں اور مرے ہوؤں کو دیکھنا عام سی بات ہو گئی تھی۔

میں نے بعض اوقات ٹائفس کے مریضوں کے ساتھ وقت گزارا جنھیں بہت تیز بخار ہوتا اور اکثر وہ مدہوشی کی حالت میں اور قریب المرگ ہوتے۔ اُن میں سے ایک کی موت مواقع ہو گئی تھی اور میں نے اسے کسی جذباتی کیفیت کے بغیر ہی دیکھا۔ اس قسم کے مناظر اکثر بار بار ہر موت کے وقت دکھائی دیتے تھے۔ قیدی ان لاشوں کے ساتھ جو کچھ کرتے، وہ بھی ناقابل بیان لگتا ہے۔ ایک قیدی نے ایک مُردہ کا بچا ہوا آلو والا کھانا اچک لیا۔ ایک قیدی نے ایک مُردہ کے جوتے اتار لیے اور یوں وہ اپنے تئیں خود کو بہتر سمجھنے لگا۔ تیسرے آدمی نے ایک مرے ہوئے آدمی کا کوٹ اتار لیا۔ ایک اور قیدی کو خوشی تھی کہ اس نے مردہ کے جسم سے اصلی ہار اتار لیا ہے۔

Scanned by CamScanner

یہ تمام چیزیں میں نے بہت ہی بے توجہی سے دیکھیں۔ بہ ظاہر میں نے نرس سے کہا کہ لاش کو ہٹادو تو جب اس نے اس کا فیصلہ کیا تو اس نے لاش کی ٹانگیں پکڑیں اور اسے چھوٹی سے راہ داری سے کھینچتا ہوا لے گیا۔ اس راہ داری کے دونوں جانب پچاس مریضوں کے بستر لگے ہوئے تھے۔ ہم جب سے غذائی قلت کا شکار ہوئے، دو سیڑھیاں جو کھلی فضا میں کھلتی تھیں، ہمارے لیے ہمیشہ ہی بہت مسئلہ رہیں۔ کیمپ میں قیام کے چند ماہ کے اندر اتنی نقاہت ہو چکی تھی کہ ہم یہ دو سیڑھیاں ہی طے نہیں کر سکتے تھے۔ ہر سیڑھی تقریباً چھے انچ بلند تھی جس پر چڑھنے کیلئے کوئی سہارا نہیں تھا، لہٰذا ہاتھوں کو سہارا دیے بغیر ہی ہمیں خود کو آگے کی جانب کھینچنا پڑتا تھا۔

لاش کے ساتھ جو آدمی ہوتا، پہلے وہ خود کو سیڑھیوں پر کھینچتا، پھر لاش کو ٹانگوں سے کھینچتا ہوا سیڑھیوں سے اس انداز سے گزارتا کہ پہلے لاش کی ٹانگیں، پھر دھڑ اور آخر میں لاش کا سر بہت زیادہ آواز کے ساتھ ٹکراتا ہوا دونوں سیڑھیوں سے گزرتا۔

میرا قیام خیمے کے دوسری جانب اسی فوجی ہسپتال کی طرف تھا جہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ میں جس بیمار آدمی کے ساتھ دو گھنٹے پہلے بیٹھا باتیں کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس کی لاش اسی بے دردی سے گھسیٹ رہا ہے اور مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں فوراً اس کی طرف سے پھیر لیں اور اپنی یخنی پینی شروع کر دی۔

اس واقعے سے میری جذباتی وابستگی نہیں تھی، اس لیے شاید میں اسے یاد نہ رکھتا۔ لیکن چونکہ میری پیشہ ورانہ دلچسپی ضرور تھی، اس لیے کچھ احساس تھا، لہٰذا یہ واقعہ مجھے یاد رہ گیا۔

بے حسی، حقیقت بینی کے جذبات اور یہ احساس کہ کسی کا کوئی خیال نہیں رکھا جائے گا، دوسرے مرحلے کے دوران نفسیاتی ردِعمل کی علامات تھیں۔ اور ظاہر ہے، دن رات کی مسلسل مار پیٹ اس کیفیت کا باعث تھی۔ دراصل، اس عدم حساسیت کے ذریعے قیدی خود کو ایک بہت ہی لازمی حفاظتی خول میں بند کر لیتے تھے۔

Scanned by CamScanner

مار پیٹ تو بہ ظاہر چھوٹی موٹی باتوں پر ہوتی تھی، بلکہ بعض اوقات اس کا کوئی سبب ہی نہیں ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، ہمیں روٹی کام کی جگہ پر ملتی تھی اور اس کیلئے سیدھی قطار بنانا ضروری تھا۔ ایک روز میرے پیچھے کھڑا ہوا آدمی اس قطار سے ذرا سا اِدھر اُدھر ہو گیا اور قطار کی یکسانیت برقرار نہ رہی تو شودا استافل کو اس پر غصہ آیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا، میرے پیچھے قطار میں کیا ہو رہا ہے کہ اچانک میرے سر پر دو ڈنڈے پڑے۔ تبھی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شودا استافل گارڈ اپنی چھڑی لیے کھڑا تھا۔ ایسے لمحے، زیادہ تر جسمانی درد اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا تھا جتنا کہ یہ احساس گزند پہنچاتا تھا کہ یہ کیا ناانصافی ہے جس کا کوئی سبب ہی نہیں۔

اس سے بھی حیران کن بات یہ کہ مخصوص مواقع پر جن ڈنڈوں کے نشانات نہیں پڑتے تھے، ان کی تکلیف نشان پڑنے والی زدوکوب سے زیادہ تکلیف پہنچاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں ریلوے ٹریک پر کھڑا تھا۔ برفانی طوفان جاری تھا۔ لیکن ہماری جماعت اس موسم کے باوجود اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔ میں نے پوری مشقت سے اپنا کام جاری رکھا اور بجری ڈھوتا رہا، کیوں کہ اتنے یخ موسم میں اپنا جسم گرم رکھنے کا ایک یہی طریقہ تھا۔ صرف ایک لمحے کیلئے میں سانس لینے کے واسطے اپنے بیلچے پر جھکا۔ اسی اثنا میں، گارڈ نے مجھے دیکھ لیا اور وہ سمجھا کہ شاید میں ستا رہا ہوں۔ اس نے اس لمحے جو تکلیف پہنچائی، وہ میری تذلیل یا مار پیٹ کے باعث نہیں تھی۔ گارڈ نے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھے کچھ کہے اور ٹوکے، چاہے کوئی غلیظ لفظ ہی بک دے، بلکہ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور مجھے دے مارا۔ میرے لیے یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک پالتو حیوان کو اپنے کام پر لگانے کیلئے اسے ٹہوکا دیا جائے۔

مار پیٹ کا سب سے تکلیف دہ حصہ وہ ہے جس میں تذلیل بھی کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ہمیں برفیلی راستے پر لمبے اور بھاری شہتیر اٹھا کر لے جانے تھے۔ اس دوران اگر ایک آدمی بھی پھسل جاتا تو صرف اس کی جان ہی خطرے میں نہ تھی، بلکہ یہ شہتیر تھامے ہوئے

Scanned by CamScanner

تمام ہی قیدیوں کی جانیں خطرے میں آ جاتیں۔ میرے ایک پرانے دوست کے کولھے میں پیدائشی خرابی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نقص کے باوجود وہ کام کرنے کے قابل تھا، کیوں کہ ایسے نقص والوں کیلئے موت کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ہوا یوں کہ بھاری شہتیر اٹھاتے ہوئے وہ پھسل گیا اور اس کے ساتھ دوسرے بھی گھسٹتے چلے گئے۔ چونکہ میں شہتیر اٹھائے ہوئے نہ تھا، اس لیے میں نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا، ایک لمحہ بھی ٹھیرے بغیر اس کی مدد کیلئے دوڑا۔ اسی دوران، میرے پیٹ پر کسی نے زور سے مارا، تند انداز میں ڈانٹا اور مجھے واپس اپنی جگہ جانے کا حکم دیا۔ چند منٹ پہلے یہی گارڈ کہ جس نے مجھے مارا تھا، ہمیں برا بھلا کہتے ہوئے سمجھا رہا تھا کہ تم خنزیر کے بچوں کو دوستی نباہنا بھی نہیں آتی۔

ایک اور مرتبہ کہ جب درجہ حرارت دو درجے فارن ہائیٹ تھا، جنگل میں ہم نے پانی کے پائپ بچھانے کیلئے سخت مٹی کھودنی شروع کی۔ میں کام کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اسی دوران موٹی سرخ ٹھوڑی والا ایک فورمین میری طرف آیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے سور کا سر یاد آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اتنی سخت سردی سے بچاؤ کیلئے گرم دستانے پہنے ہوئے ہیں۔ ایک لمحے کیلئے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں محسوس کر چکا تھا کہ مصیبت میرے سر تک آ پہنچی ہے۔ اس نے میرے سامنے پڑے مٹی کے ڈھیر کو دیکھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں نے کتنا گڑھا کھودا ہے۔

پھر اس نے بکنا شروع کیا: ''خنزیر کا بچہ، میں تجھے بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں تجھے سکھاتا ہوں کہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔ تجھے مجبور کر دوں گا کہ تو اپنے دانتوں سے یہ گڑھا کھودے یا کتے کی موت مرے۔ تو اس دنیا میں دو دن کا مہمان ہے۔ تو نے زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا۔ ویسے، تم کرتے کیا تھے؟ کیا بزنس مین تھے؟''

میں اپنے ماضی کے بارے میں بہت محتاط تھا۔ مجھے اس کی قتل کی دھمکی کو بہت سنجیدگی سے لینا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے

Scanned by CamScanner

ہوئے بولا: ''میں ایک ڈاکٹر تھا... ایک اسپیشلسٹ۔''

''کیا؟ ڈاکٹر؟ پھر تو تم نے لوگوں سے بہت سا پیسہ بٹورا ہوگا۔''

''کاش ایسا ہوتا، مگر میں نے زیادہ تر جو کام کیا، وہ بغیر کسی پیسے کے عوض کیا ہے... غریبوں کیلئے۔'' غالباً میں ضرورت سے زیادہ ہی بول گیا تھا۔ اس نے مجھے نیچے پھینکا اور مجھ پر چڑھ گیا اور پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ اِس دوران اُس نے کیا کچھ بکا۔

میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جب کسی قیدی پر غصہ اتارا جاتا ہے تو کس قدر کرب انگیز ہوتا ہے۔ یہ کرب ظلم یا درد کا نہیں ہوتا، بلکہ اس ظلم کے ساتھ جو تحقیر منسلک ہوتی ہے، وہ سخت اذیت ناک ہوتی ہے۔ جب میرے ساتھ یہ ہوا تو میرا خون کھولنے لگا اور پیشانی پر اس کا اثر نظر آیا، کیوں کہ ایک ایسا آدمی میری زندگی پر تبصرہ کر رہا تھا جو میرے بارے میں بہت ہی کم جانتا ہے۔

خود قسمتی سے مجھ پر جو کیپو لگایا گیا تھا، وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا، کیوں کہ میں اس کی عشقیہ داستانیں اور ازدواجی مسائل توجہ سے سنتا تھا۔ وہ یہ واقعات دورانِ کار طویل مارچ کے دوران سناتا تھا۔ میں نے اس کی شخصیت کے بارے میں جو تجزیہ کیا اور اسے معالجاتی مشورے دیے، اس کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت متاثر تھا۔ اس پر وہ میرا شکر گزار تھا اور میری بہت قدر کرتا تھا۔ وہ اکثر اگلی پانچ قطاروں میں میرے لیے اپنے برابر کی جگہ رکھتا۔ اس جگہ پر صرف دو سو اسی افراد ہی بیٹھ سکتے تھے۔ میرے لیے یہ چیز بہت اہم تھی۔ ہمیں منہ اندھیرے صبح سویرے اس کیلئے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ ہر ایک اس وجہ سے ڈرتا تھا کہ اگر اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی تو اسے پچھلی قطاروں میں کھڑا رہنا پڑے گا۔ اگر کسی ناپسندیدہ کام کیلئے مزدوروں کی ضرورت ہوتی تو سینئر کیپو اٹھتے اور پچھلی قطاروں میں کھڑے قیدیوں میں سے چند کو نکال لیتے۔ ان منتخبہ قیدیوں کو اجنبی گارڈوں کے حکم پر جو کام

Scanned by CamScanner

بھی کہا جاتا، کرنا پڑتا تھا۔ یوں، اُن کی دوڑیں لگ جاتی تھیں۔ اگلی پانچ قطاروں میں بیٹھے سینئر کیپو عموماً ایسے ہی قیدیوں کو منتخب کرتے تھے جو خود کو ذرا ہوشیار بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر کوئی احتجاج کرتا یا درخواست، اس کی تواضع لاتوں سے کی جاتی۔ صرف، یہ نہیں، اس کے بعد انھیں مسلسل طعنوں اور گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا۔

لیکن، چونکہ میرا کیپو اپنے دل کی بھڑاس مجھ سے نکال لیتا تھا، اس لیے میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ اس کے دل میں میری عزت تھی۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور سہولت بھی میسر تھی۔ میرے جسم میں ورم تھا اور میرے ٹانگیں سوجی ہوئی تھیں کہ بہ مشکل اپنے گھٹنے موڑ سکتا تھا۔ میں اپنے جوتے کے تسمے نہیں باندھتا تھا تاکہ سوجے ہوئے پیر اس میں سما سکیں۔ موزے پہننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میرے ننگے پیر ہمیشہ گیلے رہتے اور جوتے برف سے بھرے ہوئے۔ ظاہر ہے، یہ چیز پالا مار (فراسٹ بائٹ) اور سوجن (چل بلین) کا باعث ہوتی تھی۔ ہر قدم میرے لیے شدید اذیت کا باعث ہوتا۔ مارچ کے دوران برف پر چلتے تو برف کے ڈھیلے جوتوں پر جمع ہو جاتے۔ قیدی بار بار گرتے تو اُن کے پیچھے آنے والے فوجی انھیں مزید ٹھوکریں رسید کرتے۔ پھر ایک قطار کچھ دیر کیلئے ٹھہر جاتی، لیکن زیادہ دیر کیلئے نہیں۔ محافظوں میں سے کوئی ایک آگے بڑھ کر انھیں اپنی بندوق کی بٹ مارتا تاکہ گرنے والا جلدی سے اٹھ کھڑا ہو۔ آپ اس قطار میں جتنا آگے ہوں گے، آپ اتنا ہی کم قطار میں موجود قیدیوں کی حرکت سے متاثر ہوں گے کہ رکیں یا وقت ضائع کریں۔ پھر اس تاخیر کی تلافی کیلئے درد سے پُر پیروں کے ساتھ دوڑنا بھی پڑے۔ میں اس بات سے بہت خوش تھا کہ مذکورہ کیپو نے مجھے ذاتی طور پر معالج کے طور پر مقرر کر دیا تھا، لہٰذا میں قیدیوں کی اس قطار میں سب سے آگے ہوتا اور قدرے رفتار سے چلتا رہتا۔

میری خدمات کا ایک خاص معاوضہ دوپہر کے کھانے میں سوپ کی صورت میں بھی دیا

Scanned by CamScanner

جاتا تھا۔ وہ میرے سامنے ڈونگے سے چند مٹر نکالتا۔ یہ کیپو سابق فوجی افسر تھا اور اتنا جری تھا کہ فورمین کے سامنے بھی سرگوشیاں کرلیا کرتا تھا جس سے میں کئی مرتبہ جھگڑا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں ایک اچھا کارکن ہوں۔ یہ باتیں اگرچہ موضوع سے تعلق نہیں رکھتیں، مگر اس نے میری جان بچانے میں میری مدد کی تھی۔ فورمین سے جھگڑے کے بعد وہ مجھے دوسرے گروہ (پارٹی) میں لے گیا تھا۔

اپنے دفاع کا اگلا مرحلہ ''بے حسی'' ہوتا ہے۔ یہ اس مرحلے کی بڑی علامت ہے۔ اس موقع پر سب سے بڑی خواہش و کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنی جان بچائی جائے۔ قیدی جب دن بھر کی سخت محنت کے بعد واپس کیمپ میں آتے تو ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے یہ کہنا بہت عام سی بات تھی کہ چلو، ایک دن اور گزر گیا۔ میں تناؤ کی اس کیفیت کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہوں کہ ایسے میں قیدیوں کی تمام تر توجہ زندہ رہنے پر لگی ہوتی تھی اور نتیجتاً وہ پستی میں گر جاتے تھے۔ کیمپ میں موجود میرے کئی قلیق جو سائیکو اینالیسس کے تربیت یافتہ تھے، بتاتے کہ اکثر قیدی ایسی ذہنی حالت میں مبتلا ہیں جو بالکل ابتدائے حیات کی ہوتی ہے۔ ایسے میں اس کی خواہشات اس کے خوابوں میں واضح دکھائی دیتی ہیں۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ قیدی کس قسم کے خواب کثرت سے دیکھتے تھے؟ ان کے خواب روٹی، کیک، سگرٹ اور گرم پانی کے غسل پر مشتمل ہوتے تھے۔ چونکہ یہ سادہ خواہشات پوری نہیں ہو رہی تھیں، اس لیے وہ اپنے خوابوں کے ذریعے ان کا اظہار کرتے تھے۔ آیا ایسے خوابوں کا کوئی فائدہ بھی تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ تاہم، ان حسین خوابوں سے جب یہ قیدی اٹھتے تو انھیں کیمپ کی سخت اور متشدد زندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کے خوابوں اور ان کی حقیقی زندگی میں بہت بڑا فرق تھا۔

میں وہ رات کبھی نہیں بھول سکتا کہ جب میری آنکھ ایک ساتھی قیدی کے کراہنے کی وجہ سے کھل گئی۔ وہ نیند میں تھا اور بہ ظاہر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ میں ہمیشہ سے

Scanned by CamScanner

ڈراؤنے خواب دیکھنے والوں سے پریشان رہا ہوں، اس لیے میں نے اس بے چارے کو جگادیا۔ اچانک میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا، کیوں کہ عین اسی لمحے مجھے یہ ادراک ہوا کہ کوئی بھی خواب خواہ کتنا ہی بھیانک ہو، اس اذیت انگیز کیمپ کی حقیقت سے زیادہ خطرناک نہیں ہوسکتا۔ گویا، وہ جس ڈراؤنے خواب سے گزر رہا تھا، بہ ہر حال وہ اس کیمپ سے کہیں کم ڈراؤنا تھا۔

کیمپ میں موجود قیدیوں میں چونکہ غذائی قلت انتہا کی ہوتی تھی، لہٰذا اُن میں غذا کی چاہت ایک جبلی معاملہ تھا اور اُن کی سوچ کا محور یہی تھا۔ کام کے دوران اگر اُن کا مشاہدہ کریں تو پتا چلتا تھا کہ وہ جب آپس میں ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو فوراً ان کا موضوعِ گفتگو غذا ہی ہوتا۔ کھدائی کے دوران ایک قیدی جب دوسرے کے قریب ہوتا تو اس کا سوال یہی ہوتا کہ اُس کی پسندیدہ ڈش کیا ہے۔ پھر وہ ایک دوسرے کو کھانوں کی ترکیب تیاری بتاتے اور منصوبہ بناتے کہ جب وہ مستقبل بعید میں کبھی ملیں گے تو گھر پر یہ کھانے تیار کرکے ان سے لطف اندوز ہوں گے۔ وہ کھل کر بات کرتے اور اس کی پوری تفصیل میں جاتے۔ وہ اُس وقت تک ایسا کرتے رہتے جب تک انھیں خفیہ اشاروں کنایوں سے یہ پتا نہ چل جاتا کہ محافظ آرہا ہے۔

روزانہ بعد میں قیدیوں کو جو راشن دیا جاتا، وہ عموماً لمبے پانی والے سوپ اور چھوٹی روٹی پر مشتمل ہوتا۔ مزید یہ کہ کبھی کبھار نام نہاد الاؤنس بھی دیا جاتا جو تین چوتھائی اونس مارجرین یا غیر معیاری قیمہ کے کباب یا تھوڑی سی پنیر یا مصنوعی شہد یا ایک چمچہ جام پر مشتمل ہوتا۔ یہ چیزیں ادل بدل کر روزانہ دی جاتیں۔ اگر سخت تھکا دینے والے کام کے ساتھ یخ بستہ سردی اور نامناسب کپڑوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ غذا نہایت ناکافی تھی۔ بیمار افراد جو خاص نگہ داشت میں ہوتے، انھیں کیمپ پر رہنے اور کام سے رخصت دینے کی بجائے جھونپڑے میں رہنے دیا جاتا۔ اُن کا معاملہ بھی خراب تھا۔

Scanned by CamScanner

جب ہمارے جسموں میں جلد کے نیچے کی چربی ختم ہوگئی اور ہم ڈھانچے بن گئے تو ہم خود اپنے آپ کو دیکھ سکتے تھے کہ کیسے ختم ہورہے ہیں۔ جسم کے اندر موجود نامیوں (آرگینزم) نے اپنی ہی پروٹین کھانی شروع کردی اور ہمارے عضلات غائب ہونے لگے۔ اُس وقت جسم کی مزاحمت ختم ہوچکی تھی۔ یکے بعد دیگرے، ہمارے جھونپڑے کے باسی مرتے جارہے تھے۔ ہم سب یہ اندازہ خوب ٹھیک ٹھیک لگا سکتے تھے کہ اب کس کی باری ہوسکتی ہے اور خود اُس کی باری کب تک آئے گی۔

کئی مشاہدات کے بعد ہم علامات کو خوب جان چکے تھے جس کی وجہ سے ہماری تشخیص خوب یقینی ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم وہاں بیٹھے یہ سرگوشیاں کرتے تھے کہ کون زیادہ نہیں جئے گا یا اگلا شکار کون ہے۔ جب ہم روزانہ شام میں اپنے جسم میں موجود جوئیں تلاش کرتے اور ننگے بدن کو دیکھتے تو یہی سوچتے کہ میرا جسم تو پہلے ہی سے لاش ہوچکا ہے۔ میرا اب کیا ہونا ہے؟ میرے جسم پر تو پہلے ہی بہت کم گوشت رہ گیا ہے جس میں سے بدبو آنا شروع ہوگئی ہے، کیوں کہ اب اس میں زندگی کی رمق نہیں۔

میں یہ پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ پسندیدہ غذاؤں اور کھانوں کے بارے میں خیالات قیدیوں کے دماغ پر سوار تھے اور جب بھی موقع ملتا، وہ اس پر بات کرتے۔ غالباً یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اُن کی یہ طویل عرصے پر محیط خواہش کہ انھیں دوبارہ اپنی پسند کے کھانے مل جائیں گے، محض اچھے کھانوں کی خواہش ہی نہ تھی بلکہ یہ ادراک بھی تھا کہ وہ انسانی وجود رکھتے ہیں اور اس بنا پر کھانے کے سوا کچھ سوچنے کی رمق جلد ہی ختم ہوجائے گی۔

جو لوگ اس قسم کے شدید تجربے سے نہیں گزرے، وہ شاید ہی اس روح فرسا ذہنی کرب کا ادراک کرنے کے قابل ہوں گے۔ وہ بہ مشکل یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کھائی میں کھڑے ہوکر کھدائی کرنے اور ساڑھے نو یا دس بجے کھانے کے وقفے کے سائرن کا منتظر رہنے کا کیا مطلب ہے کہ جب راشن تقسیم کیا جائے گا۔ فورمین سے اگر تعلقات بہتر ہیں تو اس سے بار

Scanned by CamScanner

بار پوچھنا کہ کیا وقت ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی جیب میں پڑی روٹی کے ٹکڑے کو یخ بستہ انگلی سے چھونا، پھر اس کا تھوڑا سا حصہ توڑ کر اسے اپنے منہ میں رکھنا اور چاروناچار اس کا آخری نوالہ لیتے ہوئے اسے واپس جیب میں ڈالنا، اور خود کو باور کرانا کہ دوپہر کو دوبارہ کھانے کو ملے گا۔

ہم راشن میں ملنے والی معمولی سی روٹی کے بارے میں یہ نہ ختم ہونے والی بے تکی بحث اگلے وقت کیلئے رکھ چھوڑتے۔ وہاں اس ضمن میں، دو رائے قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ہمیں جو بھی راشن ملتا ہے، خواہ اس کی مقدار کتنی ہی ہو، ہمیں وہ فوری کھالینا چاہیے۔ اس کے دو طرفہ فوائد تھے کہ اول بدترین بھوک مٹائی جائے، خواہ دن بھر میں ایک دفعہ اور وہ بھی بہت کم وقت کیلئے ہی سہی؛ دوسرے، راشن کے چوری ہونے یا کھو جانے کا خوف بھی نہیں ہوگا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ اپنے راشن کو تقسیم کر کے آہستہ آہستہ کھایا جائے۔ میں نے اس گروہ میں شمولیت اختیار کی۔

اس کیمپ کی چوبیس گھنٹے کی زندگی میں سب سے کرب انگیز لمحہ وہ ہوتا تھا کہ جب رات کے کسی پہر ہم اپنی خواہشات بھرے خواب دیکھتے ہوئے سو رہے ہوتے اور تین سیٹیوں کی کرخت آواز ہمارے رگِ جاں کو چیر جاتی۔ پھر ہم اپنے گیلے جوتوں سے دنگل شروع کر دیتے اور اپنے متورم اور سوجے ہوئے پیر ان میں زبردستی گھسانے کی کوشش کرتے۔ ساتھ ہی رونے اور کراہنے کی آوازیں آتیں جن کا سبب معمولی مشکلات ہوتیں۔ مثلاً، خاردار تار میں پھنس کر جوتے کے تسمے کا کٹ جانا۔ ایک دن میں نے ایک ایسے شخص کو روتے چلاتے ہوئے دیکھا جو بہت ہی جری اور باوقار تھا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا، کیوں کہ اس کے جوتے ٹھنڈ کی وجہ سے اتنے سکڑ گئے تھے کہ انھیں پہننا اس کیلئے ممکن نہ رہا تھا۔ اور اب اسے ننگے پاؤں برفیلی زمین پر چلتے ہوئے جانا تھا۔ ان بھیانک لمحات میں، مجھے کچھ وقت آرام کا مل جاتا؛ روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو میں اپنی جیب سے نکالتا اور پورے

Scanned by CamScanner

لطف کے ساتھ چباتا۔

غذائیت میں کمی ایک جانب غذا کی طرف رغبت کا باعث تھی تو دوسری جانب اس بات کا بھی پتا چلتا تھا کہ جنسی خواہش مر چکی ہے۔ ذہنی دھچکے کے ابتدائی اثر سے قطع نظر، یہ ایک ظاہری علامت تھی اور ایک ماہر نفسیات کے ذمے تھا کہ وہ تمام مردانہ کیمپوں میں اس کا مشاہدہ کرے۔ اس کے برخلاف، دیگر مردانہ منتظمہ شعبوں میں مثلاً فوجی بیریکس میں، کچھ نہ کچھ جنسی بگاڑ تھا۔ حتیٰ کہ قیدیوں کو سیکس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے مایوسانہ جذبات نے انھیں کسی بھی ایسے کام سے روک رکھا تھا۔

قیدیوں کی اکثریت اپنے آپ کو بچانے پر متوجہ تھی جو کسی بھی شخص کیلئے قطعاً عدم توقیر کی بات ہے کہ اس کا کوئی مقصد نہیں۔ اس سے قیدی کے مکمل عدم جذبات کا پتا چلتا تھا۔ اس کی حقیقت مجھ پر اس وقت کھلی کہ جب مجھے آشویٹز سے ڈاکہاؤ کے ایک کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ ٹرین میں ہم دو ہزار قیدی سوار تھے۔ ہمارا گزر ویانا سے ہوا۔ آدھی رات کے قریب ہم ویانا کے ایک ریلوے اسٹیشن سے گزرے۔ اس راستے میں وہ گلیاں بھی آئیں جہاں میں پیدا ہوا تھا اور اپنی زندگی کے کئی برس گزارے تھے۔ بلکہ قیدی بنائے جانے سے پہلے تک میں یہیں رہتا تھا۔

اس ڈبے میں پچاس قیدی موجود تھے اور دو چھوٹے چھوٹے جھروکے تھے کہ جن سے بہ مشکل باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ فرش پر چند لوگ ہی اکڑوں بیٹھ سکتے تھے۔ جبکہ جو لوگ کھڑے ہوئے تھے، جھروکے کے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے تھے۔ اپنی انگلیوں کے بل کھڑے ہوئے میں نے باہر جھانکا تو مجھے اپنے آبائی قصبے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ میں خود کو زندہ سے زیادہ مُردہ تصور کر رہا تھا۔ چونکہ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہمیں ''ماتاسین'' میں واقع کیمپ میں لے جایا جا رہا ہے، اس لیے ہماری زندگی کے اب ایک یا دو ہفتے ہی باقی ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے اپنے بچپن کے گلی کوچوں کے مناظر ایک مُردہ شخص کی حیثیت سے دیکھے

Scanned by CamScanner

ہیں جو کسی دوسری دنیا سے آیا ہے اور نیچے بھوت شہر کو دیکھ رہا تھا۔

کئی گھنٹے کی تاخیر کے بعد ٹرین چلنی شروع ہوئی۔ راستے میں گلیاں نظر پڑیں... ان میں میری گلی بھی تھی۔ بڑی تعداد میں جوان لڑکے جو کیمپ میں اپنی زندگی گزار چکے تھے، اُن کیلئے یہ سفر بہت ہی بڑا واقعہ تھا اور وہ جھروکوں سے باہر دیکھے جا رہے تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے کچھ دیر کیلئے باہر دیکھ لینے دیں کہ یہ میرا آبائی علاقہ ہے۔ لیکن انھوں نے میری یہ درخواست نہایت بدتمیزی اور بدتہذیبی سے مسترد کر ڈالی، ''تم تو بہت عرصہ یہاں رہے ہو۔ پھر تمہیں یہاں کیا دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تم تو اس علاقے کو پہلے ہی بہت دیکھ چکے ہو۔''

بالحیث المجموع اس کیمپ میں ''ثقافتی بے حسی'' بھی تھی۔ صرف دو استثنا تھیں: سیاست اور مذہب۔ پورے کیمپ میں ہر جگہ اور مسلسل سیاست پر بات ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو زیادہ تر افواہوں کی بنیاد پر تھی جو بہت تیزی اور دلچسپی سے پھیل جاتی تھیں۔ فوجی صورتِ حال کے بارے میں افواہیں عموماً متضاد ہوتی تھیں۔ یہ افواہیں بہت تیزی سے ایک سے دوسرے قیدی تک پہنچتیں اور ہر قیدی کے ذہن میں گردش کرتی رہتیں۔ بعض پُر امید افواہوں کے باعث جنگ کے فوری خاتمے کی امید پیدا ہوتی، لیکن اکثر دیگر افواہوں کی وجہ سے یہ امید مایوسی میں بدل جاتی۔ بعض مرد تو بالکل ہی ناامید ہو چکے تھے، لیکن ایسے افراد بھی تھے جو پُر امیدی پر اڑے ہوئے تھے اور سختی سے اس پر کاربند تھے۔

قیدیوں کی مذہبی دلچسپی جو جلد یا بدیر اُن میں پیدا ہوتی، سب سے زیادہ قوی اور قابل مشاہدہ تھی۔ مذہبی یقین یعنی عقیدے کی گہرائی اور طاقت اکثر آدمی کو حیران کن حد تک آگے بڑھا دیتی اور نئی منزل تک لے جاتی ہے۔ سب سے پُر اثر تعلق اس وقت بنتا کہ جب ہم رات کی تاریکی میں جانوروں کے ٹرک میں سفر کرتے ہوئے یا کام سے تھکے ماندے، بھوکے اور پھٹے پھٹیچر کپڑوں میں ملبوس جھونپڑے کے کونے میں عبادت کرتے۔

Scanned by CamScanner

سردیوں کے دن تھے اور موسم بہار، انیس سو پینتالیس میں میعادی بخار (ٹائیفائڈ) کی وبا پھوٹ پڑی جس نے تقریباً ہر قیدی کو متاثر کیا۔ کمزور اور سخت محنت کرنے والے لوگوں میں شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ بیماروں کے کوارٹرز بہت ہی نامناسب تھے اور اُن میں عملی طور پر کوئی دوا تھی نہ خدمت گار۔ بیماری کی بعض علامات انتہائی ناقابل بیان تھیں۔ مثال کے طور پر، بعض لوگ ایک لقمہ بھی کھانے کے قابل نہ تھے جو اُن کی زندگی کیلئے بہت ہی خطرناک تھا۔ ایسے ہی مریضوں کو غشی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ غشی کی سب سے خطرناک حالت میرے ایک دوست پر طاری ہوئی جو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مرنے والا ہے اور اب اسے اپنا آخری وقت عبادت میں گزارنا چاہیے۔ غشی کے دوران وہ اول فول بک رہا تھا۔ غشی کے دوروں سے بچنے کیلئے میں نے اور دیگر بہت سوں نے رات کو زیادہ سے زیادہ دیر جاگنے کی کوشش کی۔ میں گھنٹوں اپنے دماغ میں مختلف باتیں گڑھتا رہتا۔ بہ ظاہر، میں اپنی کتاب کا وہ مسودہ دوبارہ تیار کر رہا تھا جو میں آشویٹز کے چیمبر میں کھو چکا تھا۔ اس کیلئے میں ایک چھوٹے سے کاغذ کے بوسیدہ ٹکڑے پر کلیدی الفاظ لکھتا رہتا تھا۔

موقع بہ موقع ایک سائنسی بحث کیمپ میں چھڑ جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ایسا واقعہ دیکھا جو میں اپنی عام زندگی (کیمپ سے پہلے کی زندگی) میں دیکھ چکا تھا جو میری پیشہ ورانہ دلچسپی کا تھا: روحانی کشف۔ کیمپ کے چیف ڈاکٹر نے جو خود بھی قیدی ہی تھا، مجھے ایک مرتبہ بلایا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سائیکاٹری کا ماہر ہوں۔ یہ ملاقات بیماروں کے کوارٹر میں اس کے ایک چھوٹے سے نجی کمرے میں ہوئی۔ وہاں ایک چھوٹا سا حلقہ جما ہوا تھا جس میں خلاف قانون شعبہ صحت و صفائی کا وارنٹ آفیسر بھی موجود تھا۔

ایک آدمی نے ایک دعا کے انداز میں روحوں کو پکارنا شروع کیا۔ کیمپ کا کلرک سادہ کاغذ لے کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا، لیکن اس کی توجہ لکھنے پر نہیں تھی۔ اگلے دس منٹ میں اس کے ہاتھ میں موجود پنسل نے آہستہ آہستہ چند لکیریں کھینچیں۔ دس منٹ بعد یہ مجلس

Scanned by CamScanner

برخاست کردی گئی، کیوں کہ اس دوران روحوں سے باتیں کرنے والے کو دیا گیا وقت ختم ہو چکا تھا اور وہ اس دوران روح کو ظاہر کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کلرک نے صرف VAE V کے الفاظ ہی لکھے تھے اور اس کی توجیہ یہ پیش کی گئی کہ کلرک لاطینی زبان نہیں جانتا اور اس نے اس سے پہلے کبھی لفظ vae victis نہیں سنا (تو وہ بھلا یہ کیسے لکھ سکتا ہے)۔ [اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ''جو لوگ جنگ میں شکست کھا چکے ہیں، اب وہ کلی طور پر اپنے فاتحین کے رحم و کرم پر ہیں... اور انھیں اپنے فاتحین سے کسی قسم توقع، درخواست یا رحم دلی کی خواہش نہیں رکھنی چاہیے۔'' مترجم] میرے خیال میں، اس نے زندگی میں ایک بار یہ لفظ سنا ہوگا اور کسی حافظے کے بغیر وہ اُن کی ''روح'' (اُن کا لاشعور) میں موجود ہوگا۔

کیمپ میں جسمانی اور ذہنی تشدد کے باوجود یہ ممکن تھا کہ لوگوں کی روحانی سطح میں گہرائی آجائے۔ ایسے حساس افراد جنھوں نے بہت زیادہ علمی تحقیقی زندگی بسر کی ہو، وہ سخت اذیت میں تھے۔ ان میں سے اکثر لگے بندھے ضابطوں کے قائل تھے (اور نازک طبع بھی)، لیکن ان کی اندرونی شکست وریخت کم تھی۔ یہ لوگ اپنے اردگرد کے بیرونی وحشت ناک ماحول کو اپنی اندرونی ثروت اور روحانی آزادی میں بدلنے کے قابل تھے۔ ایک یہی ناقابل فہم مناقضہ ہے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ چند قیدی کیمپ کی وحشت واذیت کے باوجود بہ ظاہر بہتر زندگی کیلئے بچ پائے۔ اس کے برخلاف، قوی جسم اور مزاج والوں کی بقا بھی اس ماحول میں ممکن نہ رہی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ابتدائی ایام میں کام کی جگہ پر میرے ساتھ کیا ہوتا رہا۔

بلند آواز میں ایک حکم دیا جاتا تھا کہ ''الگ الگ ہو جاؤ! آگے بڑھو! بائیں مڑو، دو تین چار! بائیں مڑو، دو تین چار! بائیں مڑو، دو تین چار! ٹوپیاں اتارو!'' یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ جب ہمیں ''ٹوپیاں اتارو'' کہا جاتا تو ہم کیمپ کے گیٹ سے گزرتے اور سرچ لائٹس ہم پر ڈالی جاتیں۔ جو اس دوران اچھی طرح مارچ نہ

Scanned by CamScanner

کرتا، اسے لات ماری جاتی۔ سب سے برا اس شخص کے ساتھ ہوا جس نے ٹھنڈ کی وجہ سے اپنی ٹوپی اپنے کانوں تک کر لی تھی اور ابھی ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

ہم کیمپ سے نکلنے والی ایک سڑک کے ساتھ ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چلتے جا رہے تھے اور راستے میں موجود بڑے پتھروں سے ٹھوکر کھاتے یا پانی کے جوہڑوں میں گھس کر کیچڑ میں لت پت ہو جاتے۔ ہماری نگرانی پر مامور محافظ ہم پر چیختے رہتے اور اپنی بندوقوں کے بٹ مار کر ہمیں چلنے پر مجبور کرتے رہتے۔ اگر کسی کے پاؤں زخمی ہیں تو وہ اپنے قریبی ساتھی قیدی کے کندھے پر سہارا لے سکتا تھا۔ بہ مشکل کوئی کچھ بولتا۔ برفانی ہواؤں کی موجودگی میں کسی کو بولنے کی جرات نہ ہوتی۔ کھڑے کالر کے پیچھے اپنا منہ چھپائے ہوئے مارچ کرتے ہوئے ایک آدمی نے مجھ سے سرگوشی کی: ''اگر ہماری بیویاں ہمیں ابھی دیکھ لیں تو...! میں چاہوں گا کہ وہ اس کیمپ سے دور ہی رہیں اور انھیں پتا نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اس بات سے مجھے اپنی بیوی کا خیال آ گیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، چکنی برفیلی جگہوں سے پھسل رہے تھے، ایک دوسرے کو بار بار سہارا دے رہے تھے، اٹھا رہے تھے مگر ایک دوسرے سے کہہ کچھ نہیں رہے تھے۔ البتہ ہم دونوں یہ جانتے تھے کہ اس وقت ہم اپنی اپنی بیویوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وقفے وقفے سے میں آسمان کی طرف دیکھتا جہاں ستاروں کی روشنی دھندلا رہی تھی اور صبح کی گلابی روشنی سیاہ بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہو رہی تھی۔ میرے دماغ میں میری بیوی کی تصویر چل رہی تھی اور وہ اس وقت مجھے ایک پُراسرار شخصیت لگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے سرگوشی کر رہی ہے، مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے اور بے تکلفانہ اور حوصلہ افزایانہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ یہ بات حقیقت ہو یا نہ ہو، مگر وہ چڑھتے سورج سے زیادہ تاباں لگ رہی تھی۔

ایک خیال برق کی طرح میری نسوں میں دوڑ گیا: میں نے پہلی مرتبہ زندگی میں یہ سچ

Scanned by CamScanner

محسوس کیا کہ شاعروں نے جس محبت کو افسانوی بنا دیا ہے، دانش وروں نے جس محبت کے دعوے کیے ہیں، وہ زندگی کا کتنا بڑا سچ ہے... کہ محبت انسانی زندگی کی وہ خواہش ہے جسے آدمی اپنی زندگی کا بلند ترین ہدف بنا سکتا ہے۔ تب مجھے پتا چلا کہ شاعروں اور دانش وروں نے سب سے بڑے کس راز کی بات کی ہے: انسانی کی آزادی محبت سے اور محبت میں ہے۔ میں یہ سمجھ گیا کہ ایک آدمی دنیا میں اپنا سب کچھ کھونے کے باوجود کیسے سرشار ہو سکتا ہے۔ ایک لمحے کیلئے اس بارے میں سوچئے۔ مکمل غارت گر صورتِ حال میں کہ جب ایک آدمی کسی بھی مثبت عمل کا اظہار نہیں کر سکتا، کہ جب اس کی تکالیف ہی اس کی کل کائنات ہوں... ایسی صورت میں صرف اپنے پیارے کا تصور ہی اس کیلئے سب سے بڑی کامیابی اور خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔

میرے سامنے ایک آدمی لڑکھڑایا اور اس کے پیچھے آنے والے سب اس پر گر پڑے۔ محافظ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اُن تمام پر اپنا کوڑا برسانا شروع کر دیا۔ یوں، میرے خیالات چند لمحوں کیلئے منتشر ہو گئے۔ لیکن جلد ہی میری روح کو راستہ مل گیا اور وہ قید کی دنیا سے باہر آ گئی اور میں نے دوبارہ اپنی ''محبوبہ'' سے باتیں کرنا شروع کر دیں: میں نے اس سے کچھ پوچھا تو اُس نے جواب دیا؛ اس نے کچھ پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

* ------- * ------- *

کچھ دیر میں ہم کام کی جگہ پہنچ گئے۔ ہر شخص تاریک جھونپڑے کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس امید میں تھا کہ شاید اس کے ہاتھ کچھ بہتر اوزار لگ جائے۔ ہر قیدی کو ایک بیلچہ یا گینتی تھما دی گئی۔

اسی دوران اندازہ ہوا کہ معاملہ گزشتہ دنوں جیسا ہی ہے، کیوں کہ ایک محافظ نے چلاتے ہوئے کہا، ''سور کے بچو، جلدی نہیں کر سکتے؟'' جمے ہوئے فرش پر جب گینتیاں ماری گئیں تو وہ چیخ گیا اور وہاں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ لوگ خاموش تھے اور اُن کے

Scanned by CamScanner

دماغ سن ہو چکے تھے۔

میرا دماغ اب بھی میری بیوی کے خیال میں اٹکا ہوا تھا۔ اسی وقت سوال کو نجا کہ کیا وہ ابھی زندہ بھی ہے یا نہیں؟ میں صرف ایک بات جانتا تھا: محبت محبوب کے جسمانی وجود سے کہیں آگے کا معاملہ ہے۔ یہ اپنا روحانی وجود پا ہی لیتا ہے۔ وہ حقیقتاً (جسمانی لحاظ سے) موجود ہو یا نہ ہو، وہ بہ ہر حال زندہ ہے۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ ہر دَم، ہر لحظہ باقی ہے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بیوی زندہ ہے یا نہیں۔ اسے ڈھونڈنے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا، کیوں کہ باہر سے کوئی ڈاک یہاں آنے اور یہاں سے باہر ڈاک جانے کے تمام راستے مسدود تھے۔ لیکن، اس لمحے یہ محض ایک معاملہ تھا۔ مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی محبوبہ کے بارے میں میرے خیالات اور تصورات کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر مجھے یہ پتا چل جائے کہ میری بیوی مر چکی ہے تو... میں سمجھتا ہوں کہ میں تب بھی اس کے بارے میں سوچتا رہوں گا اور اپنے ذہن میں اس سے باتیں کروں گا۔ میرے لیے یہ بہت واضح ہے اور اطمینان بخش۔ میرے دل پر یہ مہر ثبت ہے کہ محبت موت کی طرح قوی ہے۔

ایک قیدی کیلئے اس کے وجود کی روحانی غربت اور کھوکھلے پن کے مقابلے میں اندرونی زندگی کی شدت اس کیلئے پناہ کا راستہ تلاش کرنے میں بہت معاون ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کام خود کو اپنے ماضی میں فرار کرا کے کر سکتا ہے۔ جب اسے بے لگام کر دیا جائے تو اس کا تصور ماضی کے واقعات میں چلا جاتا ہے۔ اکثر بہت سے واقعات اور چیزیں اہم نہیں ہوتیں بلکہ معمولی اور ادنا ہوتی ہیں۔ اس کی ماضی کی یادیں چمکنے لگتی ہیں اور وہ انھیں اجنبی کردار سمجھنے لگتا ہے۔ ان کی دنیا اور اُن کا وجود بہت دور دکھائی دیتا ہے اور اُن کی روح بڑے اشتیاق سے دور تک جاتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اپنے ذہن میں بس کی سواری اختیار کی۔ اپنے اپارٹمنٹ کا مرکزی دروازہ کھولا۔ اپنے فون کا جواب دیا۔ روشنیاں جلا لیں۔ ہمارے خیالات اکثر ان تفاصیل پر مرکوز ہوتے ہیں اور

Scanned by CamScanner

یہ یادیں ہمیں آنسو رلاتی ہیں۔

جوں جوں قیدی کی اندرونی زندگی شدید ہوتی، وہ فن اور فطرت کے حُسن کا تجربہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ کرتا۔ اس اثر کی وجہ سے وہ بعض اوقات بھیانک حالات کو بھی بھول جاتا۔ آشویٹز سے بوارین کیمپ تک کے سفر کے دوران اگر کوئی ہمارے چہرے دیکھتا تو اس کیلئے یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ چہرے اُن مَردوں ہی کے ہیں جو زندگی اور آزادی کی تمام امیدیں کھو چکے ہیں۔ اس کے باوجود... یا شاید اسی وجہ سے... ہم فطرت کے حُسن سے بہت دور تھے، جس کی وجہ سے ہم طویل عرصے سے یہ چیزیں کھو چکے تھے۔

کیمپ میں بھی ایک آدمی نے ہمارے ایک ساتھی کی طرف توجہ دلائی جو کام میں مصروف تھا اور اس کے قریب ہی طلوع ہوتے سورج کا حسین منظر تھا اور سورج کی روشنی بوارین کی لکڑی کے بلند درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ وہی لکڑی تھی جس سے گولہ بارود کا ایک بڑا اور خفیہ پلانٹ تیار کیا گیا تھا۔ ایک دن ہم دن بھر کی شدید تھکن کے مارے، ہاتھ میں سوپ کا پیالہ لیے اپنی رہائش گاہ میں فرش پر پڑے ہوئے تھے کہ ہمارا ایک قیدی ساتھی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے ہمیں تیزی سے اسمبلی گراؤنڈ کی طرف جانے اور غروبِ آفتاب کا حیرت انگیز منظر دیکھنے کو کہا۔ باہر کی جانب کھڑے ہو کر ہم نے دیکھا کہ مغرب کی سمت بادل موجود ہیں اور ان بادلوں کی شکل بدل رہی ہے اور رنگت نیلی سے سیاہی مائل سرخ ہو رہی ہے۔ خشک سرمئی مٹی سے بنی دیواروں اور مٹیالی زمین نے آسمان کو کہیں پُرکشش بنا دیا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد، ایک قیدی نے دوسرے سے کہا، ''یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے!''

ایک اور مرتبہ کہ جب ہم کھائی میں کام میں مصروف تھے، ہمارے گرد سورج طلوع ہوتے وقت کی سرمئی کرنیں موجود تھیں۔ اوپر سرمئی آسمان تھا۔ طلوعِ آفتاب کی پیلی روشنی میں برف بھی سرمئی ہو چلی تھی۔ ہمارے چیتھڑے کہ جن میں ہم ملبوس تھے، سرمئی ہو چکے

Scanned by CamScanner

تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے چہروں پر بھی سرمئی رنگ ٹمٹمار ہا تھا۔ میں دوبارہ اپنی بیوی سے خاموشی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ یا یوں کہیے کہ میں اپنے دکھوں کی وجہ تلاش کر رہا تھا کہ میں کیوں آہستہ آہستہ مرتا جا رہا ہوں۔ مجھے لگا کہ میری روح مایوسی کے غبارے میں چھید کر رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ناامید اور بے مقصد دنیا سے آگے نکل گئی ہے جہاں مجھے حتمی مقصد کے وجود کے اپنے تمام سوالوں کا جواب ملا ہے۔ ایک لمحے کو دور فارم ہاؤس سے ایک روشنی کوندی اور بوریا کی اداس صبح میں ہونے والی طلوع کے عین درمیان میں رنگینی بکھیر گئی۔ یوں لگا کہ چہار سو تاریکی میں روشنی پھیل گئی۔ میں کئی گھنٹے برفیلی زمین پر مہبوط کھڑا رہا۔ محافظ میرے قریب سے گزرا تو اُس نے مجھ پر جملے کسا اور میں ایک بار پھر اپنی محبوبہ سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے موجود ہے۔ وہ میرے ساتھ ہے۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں اسے چھو سکتا ہوں۔ میں اس قابل ہوں کہ اپنے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لوں۔ یہ احساس بہت ہی شدید تھا۔ وہ یہاں موجود تھی۔ پھر اسی اثنا میں، ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور میرے قریب میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ میں جو مٹی کھود کھود کر ڈھیر بنا رہا تھا، وہ اس پر بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔

اس سے پہلے میں آرٹ یعنی فن کی بات کر چکا ہوں۔ کیا اس اذیتی کیمپ میں ایسی کوئی شے تھی؟ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ آدمی کسے آرٹ کہتا ہے۔ ایک مے خانہ اور نغمہ سرائی کی محفل گاہے گاہے جمتی۔ ایک جھونپڑے کو عارضی طور پر صاف کر لیا جاتا، لکڑیوں کے چند ٹکڑے لے کر انھیں منھوں سے ٹھونک لیا جاتا اور پھر پروگرام شروع ہو جاتا۔ جو لوگ کیمپ میں واقعی اچھے مقام پر تھے، جیسے کیپو اور وہ کارکن جنھیں مارچ کیلئے کیمپ چھوڑنا نہیں پڑتا تھا، یہاں جمع ہوتے۔ وہ لوگ یہاں بیٹھ کر قہقہے لگاتے یا کچھ روتے، جس کا مقصد کچھ چیزوں کو بھولنا ہوتا۔ یہاں گانا ہوتا، شعر و شاعری، ہجو گوئی اور لطیفہ گوئی ہوتی۔ ان تمام چیزوں سے ہمیں اپنی چیزیں بھلانے میں مدد ملتی تھی۔ یہ محفلیں اتنی موثر ہوتیں کہ بعض عام قیدی بھی

Scanned by CamScanner

شدید تھکن کے باوجود مے خانہ دیکھنے کو چلے جاتے، حالانکہ اس چکر میں وہ اپنی روزانہ کی غذا سے بھی محروم ہوتے۔

نصف گھنٹے کے وقفے کے دوران میں کہ جب ہمیں سوپ دیا جاتا، ہمیں نامکمل انجن روم میں جمع ہونے کی اجازت تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہر ایک کو لمبا سوپ (پانی سے بھرپور) ایک ایک چمچہ دیا جاتا۔ قیدی حریصانہ انداز میں یہ سوپ پیتے جاتے اور ساتھ ہی اطالوی گیت گنگناتے رہتے۔ ہم گیتوں سے محظوظ ہوتے اور ہم سے دوگنا سوپ کا وعدہ کیا جاتا، یعنی مٹر بھی۔

یہ انعام صرف تفریح کا نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ تعریف کیلئے بھی تھا۔ مثال کے طور پر، مجھے کیمپ کے ایک خطرناک کیپو سے تحفظ مل گیا۔ یہ کیپو کئی وجہ سے ''قاتل کیپو'' کہلاتا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک شام مجھے یہ اعزاز ملا کہ مجھے دوبارہ روحوں سے گفتگو والے حلقے میں مدعو کیا گیا۔ اس دن بھی چیف ڈاکٹر کے وہی قریبی دوست موجود تھے اور برخلاف قانون شعبہ صفائی کا وارنٹ آفیسر بھی تھا۔ اسی اثنا میں، قاتل کیپو کمرے میں داخل ہوا اور اس سے اپنا پسندیدہ گیت گنگنانے کو کہا گیا جو کیمپ میں مشہور ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے، اسے دوبارہ یہ بات کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے تیزی سے ایک ڈائری نکالی اور اپنا شاہ کار پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ کسی کی ہنسی نکلے، میں نے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ اپنے ہونٹ ہلانے شروع کر دیے۔ اور اسی شے نے میری جاں بخشی کرادی۔ میں نے ایک دن اس کے ساتھ کام بھی کیا تھا، اور یہ ایک دن میری جان بچانے کیلئے کافی تھا۔ بہ ہر حال، اس قاتل سے اس طرح واقف ہونے کا یہ انداز خدا کی رحمت ہی تھا۔ چنانچہ مجھ سے جتنا زیادہ ہو سکا، میں نے اس کی تعریف کی اور تالیاں بجائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کیمپ میں کسی قسم کے آرٹ کی تلاش بہت ہی احمقانہ بات تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ آرٹ کا اصل تاثر تاریک رات میں اس وقت ہوتا تھا کہ جب پس منظر کے

Scanned by CamScanner

گھپ اندھیرے میں کسی بھوت کا سایہ سا دکھائی دیتا۔

میں آشویٹز کی دوسری رات کبھی نہیں بھول سکتا جب گہری نیند سے جاگ اٹھا تھا... اور اس کا سبب بلند آواز موسیقی تھی۔ جھونپڑے کا سینئر وارڈن کسی قسم کی تقریب کر رہا تھا اور وہ جھونپڑے کے داخلی دروازے کے قریب ہی تھا۔ نشے میں دھت آوازیں تھیں اور کچھ پرانے گیت گائے جا رہے تھے۔ اچانک یہ شور تھم گیا اور خاموشی چھا گئی۔ پھر، وائلن کی آواز ابھری اور اس پر غمی اور اداسی سے پُر موسیقی شروع ہوگئی۔ یہ بہت غیر معمولی موسیقی تھی۔ وائلن رو رہا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ رو رہا تھا۔ اسی دن کسی کی چوبیسویں سال گرہ بھی تھی۔ آشویٹز کے کیمپ سے کچھ فاصلے پر کوئی رہتا تھا... ممکن ہے، چند سو یا چند ہزار گز دور... مگر پہنچ سے بالکل دُور۔ وہ کوئی اور نہیں، میری بیوی تھی۔

حراستی کیمپ میں کسی قسم کے فن کے نمونے کا وجود کسی بیرونی فرد کیلئے حیران کن ہو سکتا ہے، لیکن وہ اس وقت مزید حیران ہوگا کہ جب اسے پتا چلے کہ یہاں مذاق بھی ہوتا ہے، اگرچہ چند سیکنڈ یا منٹ کیلئے ہی سہی۔ خود حفاظتی کے معرکے میں مذاق روح کا ایک اور ہتھیار تھا۔ یہ بات بہت عام ہے کہ مذاق کسی بھی دوسرے طریقے کے مقابلے میں، ایک ناگفتہ بہ صورتِ حال سے نمٹنے اور اس سے الگ ہونے کی بہت ہی موثر قابلیت ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست کو باقاعدہ یہ طریقہ سکھایا کہ کیسے حس مزاح کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے تجویز دی کہ وہ سب روزانہ کم از کم ایک دلچسپ اور پُر مذاق کہانی ضروری تخلیق کریں۔ وہ سرجن تھا اور ایک بڑے ہسپتال کے عملے پر تعینات تھا۔ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ کوشش کی کہ اسے یہ سکھاؤں کہ وہ یہاں سے نکلنے کے بعد واپس اپنے کام پر جا کر کیمپ کے طرزِ حیات کو کیسے چھوڑے گا۔ عمارت کی تعمیر کے دوران (خاص کر جب سپروائزر معائنہ کیلئے آتا) تیزی سے کام کرنے کیلئے فورمین ہم پر برستا، ''کام کرو؛ کام کرو!'' یہ سن کر میں نے اپنے دوست سے کہا، ''ایک دن تم واپس جا کر آپریشن تھیٹر میں پیٹ کا آپریشن

Scanned by CamScanner

کر رہے ہو گے کہ یک دَم سینئر سرجن آ دھمکے گا اور تم پر ایسے ہی چلائے گا، کام کرو؛ کام کرو!"

حس مزاح بڑھانے اور چیزوں اور واقعات کو پُر مزاح انداز میں دیکھنا اپنے اندر جینے کا ہنر پیدا کرنے اور اس میں مہارت لانے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصائب و تکالیف تو ہر جگہ ہیں، جبکہ جینے کا ہنر سیکھنا حراستی کیمپ میں بھی ممکن ہے۔ انسان کی تکالیف گیس کی طرح ہیں۔ اگر ایک خاص مقدار میں گیس خالی چیمبر میں بھری جائے تو ایک وقت آئے گا کہ یہ چیمبر بھر جائے گا، خواہ چیمبر بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔ اسی طرح تکالیف اور مصائب، چاہے تکالیف اور مشکلات چھوٹی ہوں یا بڑی، انسانی روح اور شعوری ذہن کو بھرتے ہیں۔ چنانچہ انسانی تکالیف کی جسامت مطلقاً اضافی معاملہ ہے۔

یہی معاملہ چھوٹی چیزوں کے ساتھ بھی ہے جو ہمیں بڑی خوشیاں دے سکتی ہیں۔ ذرا اس مثال کو لیجیے کہ جب ہم آشویٹز سے سفر کر کے ڈچاؤ کی طرف آ رہے تھے۔ ہم سب اس بات سے خوف زدہ تھے کہ یہ گاڑی ہمیں ماتھاسین کیمپ لے جائے گی (جو موت کا کیمپ مشہور تھا)۔ جب ہماری گاڑی ڈاناؤ دریا کے پل کے قریب پہنچی (یہ پل ماتھاسین کیمپ کی طرف لے جاتا ہے) تو ہمارے تجربہ کار سفری ساتھیوں نے ہمیں جو کچھ بتایا، وہ نہایت ڈراؤنا تھا۔ جنھوں نے ایسی کوئی شے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ٹرین پل پر نہیں چڑھ رہی بلکہ ڈاکہاؤ کی طرف جا رہی ہے تو پورے بدن میں خوشی دوڑ گئی۔

اور پھر، دو دن اور تین راتوں کے طویل سفر کے بعد اس کیمپ میں ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ یہاں فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ تمام افراد ایک ساتھ فرش پر بیٹھ سکیں۔ اکثریت تمام وقت کھڑی رہی۔ جبکہ چند افراد توڑی پر بیٹھ گئے جو انسانی پیشاب کرنے کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی۔ جب ہم اس کیمپ میں آئے تو ہمیں پرانے قیدیوں سے سب سے پہلی اور اہم خبر

Scanned by CamScanner

یہ ملی کہ یہاں کسی قسم کا کوئی ''اوون'' یا شمشان گھاٹ یا گیس چیمبر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں موجود کسی بھی فرد کے گیس چیمبر میں جانے کا امکان نہیں ہے۔ لیکن ہمیں بیماروں کے قافلے کی آشویٹز واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس خوش خبری سے ہم سب کا مزاج اچھا ہوگیا۔ آشویٹز میں ہمارے سینئر وارڈن کی خواہش بر آئی تھی کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے، ایسے کیمپ میں پہنچ جائیں کہ جہاں چمنی (بھٹی) نہیں ہے۔ اس بات پر ہم سب ہنسے تھے اور مذاق اڑایا تھا، حالانکہ اگلے چند گھنٹوں میں ہمارے ساتھ ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔

جب نئے آنے والوں کی گنتی کی گئی تو ہم میں ایک قیدی کم تھا۔ چنانچہ ہمیں اس وقت بارش اور ٹھنڈی ہوا میں انتظار کرنا تھا جب تک وہ قیدی نہ مل جائے۔ بالآخر، وہ ایک جھونپڑے میں مل گیا جہاں وہ تھکن کی وجہ سے سو گیا تھا۔ پھر حاضری سزا میں تبدیل ہوگئی۔ طویل سفر کے باوجود ہمیں ساری رات اگلی صبح تک باہر کھڑا رکھا گیا جس کی وجہ سے ہماری جلد جم گئی اور اکڑ گئی۔ تاہم، ہم سب بہت خوش تھے کہ یہاں کوئی چمنی نہیں اور آشویٹز یہاں سے بہت دُور ہے۔

اگلے وقت ہم نے سزا یافتہ لوگوں کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا۔ کیا ہی عجب ہے کہ تمام تکالیف ہم پر گزر رہی تھیں۔ ہم ان قیدیوں کی نسبتاً بہتر، منظم، محفوظ اور خوش زندگی پر اُن سے حسد کر رہے تھے۔ ہم افسوس کر رہے تھے کہ یقیناً اُن کے پاس غسل کرنے کے باقاعدہ مواقع تھے۔ وہ ٹوتھ برش کرتے تھے اور کپڑے صاف کرتے تھے، ان کے پاس الگ الگ گدے تھے، اور ہر ماہ اُن کے حیات رشتے داروں کی طرف سے ڈاک آتی تھی یا کم از کم انھیں یہ ضرور پتا تھا کہ آیا ان کے پیارے زندہ ہیں یا نہیں۔ یہ تمام چیزیں ہم سے زمانہ ہوا، چھینی جا چکی تھیں۔

پھر ہم اُن ساتھیوں سے حسد کرنے لگے جنھیں فیکٹری میں جانے اور وہاں سائبان والے کمروں میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ اسے

Scanned by CamScanner

ایسی خوش قسمت محفوظ جگہ ملے۔ خوش قسمتی مزید بڑھتی چلی گئی تھی۔ کیمپ سے باہر کی دنیا سے لاتعلقی کے باوجود (کہ جن میں سے ایک میں بھی تھا) چند یونٹ ایسے تھے جو دوسروں سے کہیں بدتر سمجھے جاتے تھے۔ ایک قیدی ایسے قیدی سے حسد کرسکتا تھا جس نے گہری کھائی میں کھدائی نہیں کی یا روزانہ بارہ گھنٹے ریلوے کی ڈھلواں زمین پر جو کیچڑ سے اٹی ہوئی ہو، کام نہیں کیا۔ زیادہ تر حادثات ایسے ہی کاموں میں ہوتے تھے اور ہلاکت کا باعث بنتے تھے۔

دیگر جماعتوں میں فورمین اپنی سرشت کے مطابق بے دردی سے مکے اور گھونسے برساتے تھے اور ہم اس پر بھی شکر بجالاتے تھے کہ ایسے فورمین سے خلاصی ہوئی یا اس سے پالا پڑا بھی تو عارضی۔ ایک مرتبہ بدقسمتی سے مجھے اس جماعت میں شامل کردیا گیا۔ میں ایسے ہی ظالم فورمین کی نگرانی میں کام کررہا تھا اور اگر ہوائی حملے کا سائرن نہ بجا ہوتا تو میں دو گھنٹے بعد بھی اُس کے ستم کا نشانہ بنتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے نتیجے میں، میں ٹھیلے پر لایا جاتا اور یہ ٹھیلا اکثر مرے ہوؤں یا مرتے ہوؤں کی منتقلی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا کہ جب سائرن بجتا تھا تو اس صورتِ حال میں انھیں کتنا سکون ملتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ باکسر بھی اس سکون کا ادراک نہیں کرسکتا جو آخری لمحے میں راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجنے پر ''ناک آؤٹ'' ہونے سے بچ گیا ہو۔

ہم ان چھوٹی چھوٹی کرم نوازیوں کے شکر گزار تھے۔ بستر پر جانے سے پہلے جوئیں نکالنے کا دورانیہ بھی شکر گزاری والا ہے۔ اگرچہ یہ عمل خوش گوار نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ٹھنڈے کمرے میں عریاں کھڑے رہنا ہے۔ لیکن، ہم اس پر تو شکر گزار ہیں کہ اس عمل کے دوران ہوائی حملے کا الارم نہیں بجتا تھا اور نہ روشنیاں گل کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی آدمی اپنا کام درست نہ کرپاتا تو اسے آدھی رات کھڑا رہنے کی سزا ملتی۔

کیمپ کی زندگی کی ایک چھوٹی سی لذت بہ قول آرتھر شوپنہاور ''منفی خوشی'' تھی، یعنی

Scanned by CamScanner

تکلیف سے آزادی۔ حقیقی مثبت خوشی تو بہت ہی خال تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے ایک بیلنس شیٹ بنائی ہوئی تھی جس میں اپنی خوشیوں کا اندراج کرتا تھا۔ اسے دیکھنے پر پتا چلا کہ گزشتہ کئی ہفتے میں صرف دو بار خوشی کا تجربہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ جب میں کام سے آرہا تھا تو طویل انتظار کے بعد میں باورچی خانے گیا اور وہاں مجھے قیدیوں کے اندراج پر لگا دیا گیا۔ وہ ایک بڑے تھال کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور قیدیوں کے پیالوں میں تیز تیز سوپ ڈال رہا تھا۔ وہ واحد باورچی تھا جو سوپ ڈالتے ہوئے یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کس کا پیالہ بھرا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی دوستوں اور اپنے علاقے کے لوگوں کو بھی رعایت نہیں دیتا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ جو قیدی اپنے لوگوں کو دوسروں سے زیادہ کرتے تھے، ان کے بارے میں کوئی رائے دوں۔ ایسے حالات میں کہ جہاں جلد یا بدیر زندگی یا موت کا معاملہ ہو، آدمی دوسروں پر بھلا پتھر کیوں پھینکے گا۔ کسی آدمی کو اس وقت کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے جب تک وہ پوری دیانت داری سے یہ جواب نہ دے لے کہ کیا وہ خود ایسے ہی حالات میں بغیر کسی جانب داری کے کام کر سکتا ہے۔

طویل عرصے بعد کہ جب میں دوبارہ معمول کی زندگی (یعنی کیمپ سے آزادی کے بعد) شروع کر چکا تھا، کسی نے مجھے ہفتہ روزہ ''السٹریٹڈ ویکلی'' میں قیدیوں کی تصاویر دکھائیں کہ وہ اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے ہیں اور ٹکٹکی باندھے ایک وزیٹر کو دیکھ رہے ہیں۔ اس نے پوچھا، ''کیا یہ وحشت ناک منظر نہیں کہ ہر طرف خوف ناک چہرے ہیں... آپ کیا کہیں گے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا، حالانکہ میں اس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔ ایک لمحے کیلئے میں نے یہ تصویر دوبارہ دیکھی: صبح کے پانچ بجے۔ اس وقت بھی باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میں مٹی کے فرش پر بچھے سخت تختے پر لیٹا ہوا تھا جہاں میری طرح ستر لوگ علاج کیلئے موجود تھے۔ ہم بیمار تھے اور کام کرنے کیمپ سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ پیریڈ میں بھی شریک

Scanned by CamScanner

نہیں ہو سکتے تھے۔ ہم سارا دن اپنے جھونپڑے کے کونے میں پڑے رہتے اور دوائی، روٹی (جو ظاہر ہے، بیماروں کیلئے کم کر دی گئی تھی) اور سوپ (اس میں بھی پانی اور کل مقدار کم کر دی گئی تھی) کے منتظر ہوتے۔ لیکن ہم اس کے باوجود اس پر بھی بہت مطمئن اور خوش تھے۔ ہم ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے تا کہ غیر ضروری طور پر گرمی کم نہ ہو جائے اور اتنے ست اور بے حس ہو چکے تھے کہ اپنی انگلی بھی ہلانا نہیں چاہتے تھے کہ اسی اثنا میں ہم نے کانوں کو پھاڑ دینے والی سیٹی اور انسانی آواز سنی جو رات کی شفٹ میں تبدیلی اور حاضری لگانے کیلئے تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اس جھری میں سے برفانی ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ تھکن سے چور ہمارا ایک ساتھی کمرے میں داخل ہوا جو برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ہچکچاتا ہوا چند منٹ کیلئے یہاں اندر آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن فوراً ہی سینئر وارڈن نے اسے یہاں سے نکال باہر کیا۔ یہاں بہت سخت ضابطہ تھا کہ کوئی بھی شخص جب تک اس کا باقاعدہ معائنہ نہ ہو جائے، یہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس پر افسوس تھا کہ میں اپنے ساتھی کیلئے کچھ نہیں کر سکتا تھا، مگر اس پر شکر گزار بھی تھا کہ اس وقت اس کی جگہ میں نہیں تھا، حالانکہ میں بیمار تھا اور بیماروں کے کوارٹر میں تھا۔ وہ زندگی بچانے والے دو دن اور اس کے بعد مزید دو دن کیا ہی خوب تھے۔

جب میں یہ تصاویر دیکھ رہا تھا، یہ تمام چیزیں اس وقت میرے ذہن میں آئیں۔ جب میں نے یہ سب بتایا تو مجھ سے سوال کرنے والا سمجھ گیا کہ مجھے یہ سب کیوں وحشت ناک نہیں لگا۔ اس میں دکھائے گئے افراد اتنے ناخوش ہرگز نہیں تھے۔

بیماروں کے کوارٹر میں چوتھے روز رات کے ڈاکٹر نے مجھے دوسرے کیمپ میں طبی خدمات کا کہا، کیوں کہ وہاں ٹائیفائیڈ کے مریض موجود تھے۔ اپنے دوستوں کے مشورے کے برخلاف (یہ حقیقت تھی کہ میرے کسی بھی دوست نے یہ خدمت انجام نہیں دی تھی) میں نے رضا کارانہ خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ کام کی جماعت میں رہتے ہوئے

Scanned by CamScanner

میں جلد مر جاؤں گا۔ لیکن اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری موت کا کم از کم کوئی مقصد تو ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ سبزیاں کھاتے ہوئے اور بے مقصد بے گار کرتے ہوئے مرنے سے بہتر ہے کہ بہ طور ڈاکٹر اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے ہوئے مرا جائے۔

میرے لیے یہ سادہ سی حسابی مساوات تھی، قربانی نہیں۔ لیکن، ہوا یوں کہ شعبہ صفائی کے وارنٹ آفیسر نے یہ حکم دیا کہ جب تک پہلے سے موجود ڈاکٹر ٹائفس کیمپ کو چھوڑ نہیں دیتے، نئے ڈاکٹر نہیں لائے جائیں گے۔ اسے ڈر تھا کہ یہ دو اضافی لوگ ڈاکٹر سے زیادہ اس پر لاشوں کا بوجھ نہ بن جائیں۔

میں یہ بات پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اپنے تئیں اور اپنے قریبی دوستوں سے متعلق اقدار کتنی تیزی سے کھو جاتی تھیں۔ اس مرحلے پر ہر شے قربان ہو جاتی تھی۔ ایک آدمی کا کردار ایسا ہو جاتا کہ وہ ذہنی ابتلا کا شکار ہو جاتا اور اس کی تمام اقدار خطرے میں پڑ جاتیں اور وہ شکوک و شبہات میں ڈوب جاتا۔ ایک ایسی دنیا میں پھنس کر جہاں انسانی زندگی اور انسانی عظمت کی کوئی اہمیت نہیں، جس دنیا میں انسان کی آزادی چھین لی گئی ہے، اور اسے ایک آلہ کار بنا دیا گیا ہو، آدمی کی ذاتی انا ختم ہو جاتی ہے اور اس کی اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ اگر آدمی حراستی کیمپ میں اپنی خود توقیری اور عزت کے بچاؤ کیلئے کوئی جدوجہد نہیں کرتا، وہ اپنے انفرادیت کا احساس، ذہنی وجود کا ادراک، اندرونی آزادی اور شخصی قدر سے محروم ہو جاتا۔ پھر وہ خود کو ایک جم غفیر کا بے وقعت حصہ ہی سمجھتا اور وہ حیوانی زندگی کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا۔ قیدیوں کو بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اُن کی خواہش کے بغیر ہانکا جاتا... کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تو کبھی ایک ساتھ اور کبھی الگ الگ۔ چند افراد کا مگر خطرناک گروہ انھیں ہر سمت سے دیکھتا رہتا اور بہت قرینے سے ان پر تشدد کرتا۔ وہ انسانوں کے اس ریوڑ کو مسلسل ہانکتے رہتے... کبھی آگے، کبھی پیچھے، کبھی دائیں یا بائیں... چیختے چلاتے، لاتیں اور گھونسے مارتے۔

Scanned by CamScanner

بالکل بھیڑوں کی طرح، یہ ریوڑ بھی بزدلی کے ساتھ حرکت کرتا اور ہر شخص اس جمگھٹے کے درمیان میں رہنے کی کوشش کرتا۔ یوں، ریوڑ کے چاروں جانب چلنے والے محافظوں کی لاتوں اور گھونسوں سے وہ شخص محفوظ رہتا۔ بیچ میں موجود لوگ اردگرد سے آنے والی یخ بستہ ہواؤں سے بھی محفوظ رہتے۔ یوں ہر ایک اپنے بدن کو اس مجمع کے ذریعے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کام اس ریوڑ کی ترتیب کے دوران خود ہی ہو جاتا تھا۔ لیکن دوسرے وقتوں میں یہ ہماری اپنی بہت ہی شعوری کوشش ہوتی تھی، کیوں کہ اپنی حفاظت آپ کے تحت کیمپ کا سب سے اہم قانون بھی تھا کہ نمایاں نہیں ہونا۔ ہم تمام وقت خود کو شودا استافل کی نظروں سے بچانے کی کوشش میں کرتے رہتے تھے۔

بعض اوقات مجمع سے دور رہنا نہ صرف ممکن بلکہ ضروری ہوتا تھا۔ یہ بہت عام بات ہے کہ ایسی جگہ جہاں بہ زور کام لیا جاتا ہو، ہر شے پر توجہ رکھی جاتی ہے اور غیر ضروری زور بھی ڈالا جاتا ہے۔ لہٰذا آدمی مجمع سے ایک طرف ہو کر اس سے خود کو دور کرتا ہے، خواہ بہت کم وقت کیلئے ہی سہی۔ قیدی ایسے لمحات کیلئے ترستے تھے کہ جب وہ ہوں اور بس، ان کے خیالات ان کے ساتھ ہوں۔ وہ تنہائی اور خلوت کیلئے تڑپتے تھے۔

ایک مرتبہ جب مجھے ایک نام نہاد "ریسٹ کیمپ" (جو آرام کیلئے مختص تھا) میں منتقل کر دیا گیا، مجھے بہ مشکل پانچ منٹ وقفہ تنہائی میسر آیا۔ فرشی جھونپڑے کے پیچھے جہاں میں کام کر رہا تھا، تقریباً بے ہوش مریض موجود تھے۔ اس کے کونے میں کیمپ کے گرد خاردار تاروں کے درمیان ایک خاموش جگہ تھی۔ یہاں ایک خیمہ عارضی طور پر لگا دیا تھا اور چند کھمبوں اور درختوں کی شاخوں کے ذریعے اسے سہارا دیا گیا تھا۔ یہاں نصف درجن کے قریب لاشیں رکھی جا سکتی تھیں۔ اور یہی کیمپ میں روزانہ اموات کی شرح تھی۔ وہیں سے ایک دُھرا پانی کے پائپوں کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں فارغ ہوتا تو اس کے نیچے پتوں کی چھاؤں میں اکڑوں بیٹھ جاتا۔ اور بواریں کے قدرتی مناظر میں سبز ڈھلوانیں اور دور پار

Scanned by CamScanner

نیلی پہاڑیاں تکتا رہتا۔ میں دیر تک اپنی خواہشات کے خواب دیکھتا رہتا اور میرے خیالات شرق و غرب میں یا اپنے گھر کی سمت آوارہ گردی کرتے رہتے۔ لیکن میں صرف بادل ہی دیکھ سکتا تھا۔

میرے قریب پڑی ہوئی لاشیں جن میں کیڑے پڑے ہوتے، مجھے متاثر نہ کرتے۔ صرف قریب سے گزرتے محافظوں کے قدموں کی چاپ سے میں اپنے خوابوں سے جاگ جاتا۔ وہ مجھے مریضوں کو دوا دینے یا نئی آنے والی دواؤں کی گنتی کیلئے بلاتے جو اسپرین کی پانچ یا دس گولیوں پر مشتمل ہوتی اور کئی دن پچاس مریضوں پر استعمال کی جاتی۔ میں وہ گولیاں جمع کرتا، گنتا، چکر لگاتا، مریضوں کی نبض دیکھتا اور سنگین مریضوں کو آدھی گولی دیتا۔ لیکن شدید بیماروں کو شاید ہی دوا مل پاتی۔ اُن کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی، لیکن ان میں کچھ نہ کچھ امید ضرور ہوتی تھی۔ ہلکے مریضوں کیلئے میرے پاس کچھ نہیں تھا، سوائے حوصلہ افزائی کے چند جملوں کے۔ میں یکے بعد دیگرے مریضوں کے پاس جاتا اور ساتھ ہی سوچتا رہتا کہ میں کم زور ہوں، کہیں میں بھی ٹائیفائیڈ کا شکار نہ ہو جاؤں۔ پھر میں اپنی تنہائی والی جگہ چلا جاتا جو پانی کے دُھرے کے پاس تھی۔

اس دُھرے نے اتفاقاً ایک مرتبہ تین قیدیوں کی جانیں بچائی تھیں۔ آزادی سے کچھ پہلے بڑی تعداد میں گاڑیاں ڈاکھاؤ لے جانے کیلئے منگائی گئیں۔ تین قیدیوں نے عقل مندی سے اس سفر سے بچنے کی کوشش کی۔ وہ اس دھرے پر چڑھ گئے اور محافظوں سے چھپ گئے۔ میں آرام سے وہاں بیٹھا تھا اور بچوں کی طرح خاردار تار پر کنکر مار رہا تھا۔ محافظوں نے جب مجھے دیکھا تو ایک لمحے کیلئے ہچکچائے، لیکن پھر آگے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ان تینوں کو بتایا کہ خطرہ ٹل چکا ہے۔

کسی بیرونی آدمی کیلئے یہ سمجھنا بہت ہی مشکل تھا کہ یہاں انسانی زندگی کتنی بے وقعت تھی۔ کیمپ کے قیدی سخت مشقت میں رہتے تھے، لیکن جب وہ خاص کر مریضوں کا قافلہ

Scanned by CamScanner

دیکھ لیتے تو وہ مزید فکر مند ہو جاتے کہ یہاں انسانی وجود اور توقیر کو کتنی بری طرح روندا گیا ہے۔ لاغر قیدیوں کو دو پہیوں والے ٹھیلے پر لادا جاتا جسے قیدی کئی میل تک ڈھوتے ہوئے شدید برف باری میں ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ لے جاتے۔ اگر راستے ہی میں کوئی مریض مر جاتا تو اسے وہیں پھینک دیا جاتا اور فہرست درست کر لی جاتی۔ یہ فہرست ہی سب کچھ تھی۔ ایک انسان کو صرف اس لیے گنا جاتا تھا کہ اس کا ''قیدی نمبر'' ہے۔ اصل چیز ''نمبر'' تھا... زندہ یا مُردہ.. یہ غیر اہم تھا۔ نمبر کی زندگی قطعاً غیر متعلقہ موضوع تھا۔ اس نمبر کے پیچھے ایک قسمت، ایک تاریخ اور ایک آدمی کا نام تھا۔ لاغر مریضوں کی منتقلی کے دوران ایک نوجوان قیدی کے بھائی کا نمبر فہرست میں موجود نہیں تھا، لہٰذا اس کا مطلب تھا کہ اسے وہیں چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ یہ نوجوان خاصی دیر تک گزارش کرتا رہا، یہاں تک کہ وارڈن نے ایک اور شخص کی جگہ اسے یہاں رکھنا منظور کیا جو پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن فہرست کو درست کرنا ضروری تھا۔ یہ بہت آسان تھا۔ بھائی نے ایک اور قیدی سے اپنا نمبر تبدیل کر لیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ہماری کوئی دستاویزات نہیں تھیں۔ ہر شخص اپنے بدن پر اپنی قسمت جی رہا تھا جس میں بہ ہر کیف سانس چل رہی تھی۔ ہمارے ڈھانچے تھے جن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے اور انھیں ہم سے صرف اسی وقت دلچسپی ہوتی تھی کہ جب ہمارے جسموں پر اُن سے بہتر کپڑا یا جوتا ہو۔ اس وقت وہ ہمیں تجسس سے دیکھتے اور گھورتے تھے۔ یہاں موجود لوگوں کی قسمتیں مہر بند ہو چکی تھیں۔ لیکن جو لوگ کیمپ میں رہ گئے تھے اور اب بھی کام کرنے کے قابل تھے، انھیں اپنی بقا کی بہتری کیلئے ہر اقدام کرنا پڑتا تھا۔ یہ جذبات سے عاری لوگ تھے۔ قیدیوں کو اندازہ تھا کہ اُن کا تمام تر انحصار محافظوں کے موڈ پر ہے... اور اس وجہ سے وہ انسان کم تھے اور حالات کے رحم و کرم پر زیادہ۔

آشوِیٹز میں، میں نے اپنے لیے ایک قانون بنایا تھا جو اچھا ثابت ہوا اور بعد میں میرے ساتھیوں نے بھی اس پر عمل کیا۔ میں نے عمومی طور پر، تمام سوالوں کے جوابات سچ

Scanned by CamScanner

سچ دیے۔ لیکن جو بات تفصیل سے نہ پوچھی گئی، اس کا جواب نہیں دیا۔ اگر مجھ سے میری عمر پوچھی گئی تو میں نے بتادی۔ اگر مجھ سے میرا پیشہ پوچھا گیا تو میں نے کہا، ڈاکٹر۔ لیکن اس کی تفصیل نہیں بتائی۔ آشویٹز کی پہلی صبح ایک شوداستا فل افسر پریڈ گراؤنڈ میں آیا۔ ہمیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ چالیس برس سے کم، چالیس برس سے زیادہ، دھاتی کام والے، مکینکس، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ہماری خامیوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیا گیا اور ایک اور گروپ بن گیا۔ میں جس گروہ میں تھا، اسے ایک جھونپڑے میں لے جایا گیا اور پھر ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر سوال جواب کے ذریعے ہماری چھانٹی کی گئی اور میری عمر اور پیشے کے مطابق مجھے ایک چھوٹے گروہ میں بھیج دیا گیا۔ ایک اور بار ہمیں ایک کمرے میں بھیجا اور ایک اور گروہ میں تقسیم کیا گیا۔ یہ اقدام چند بار ہوا کہ میں ایک چھوٹے سے گروہ میں آ گیا۔ وہاں میں بہت ہی ناخوش تھا اور خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا، کیوں کہ اس گروہ میں دیگر افراد غیر ملکی زبانیں بول رہے تھے۔ پھر آخری انتخاب ہوا اور میں واپس اسی گروہ میں آ گیا جہاں شروع میں تھا۔ انھیں بس اتنا پتا تھا کہ میں یکے بعد دیگرے کئی کمروں میں بھیجا گیا ہوں۔ لیکن یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ ان چند منٹ کے دوران میری قسمت نے کئی رنگ بدلے تھے۔

جب لاغر مریضوں کو ریسٹ کیمپ لے جانے والی گاڑی تیار کی گئی، میرا نام (جو میرا نمبر تھا) اس فہرست میں رکھا گیا، کیوں کہ وہاں چند ڈاکٹروں کی ضرورت تھی۔ لیکن کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ہماری منزل ریسٹ کیمپ ہی ہے۔ چند ہفتے پہلے یہی گاڑی تیار کی گئی تھی۔ اس وقت سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اس کی منزل گیس اوون ہے۔ جب یہ اعلان کیا گیا کہ وحشت ناک رات میں جو رضا کارانہ خدمات دے گا تو اس کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا جائے گا، بیاسی قیدی فوری طور پر رضا کاری کیلئے تیار ہو گئے۔ پون گھنٹے بعد یہ گاڑی منسوخ کر دی گئی لیکن ان رضا کاروں کو رات کی شفٹ کیلئے مقرر کر دیا گیا۔ ان کی

Scanned by CamScanner

اکثریت کیلئے اس کا مطلب تھا کہ وہ اگلے دو ہفتے میں مارے جائیں گے۔

ریسٹ کیمپ کیلئے یہ گاڑی دوسری مرتبہ تیار کی گئی تھی۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں تھا کہ لاغر مریضوں سے اُن کے آخری دو ہفتوں میں کام لینے کیلئے یہ جال بچھایا گیا ہے یا پھر واقعی انھیں گیس اوون لے جا کر انھیں حقیقی آرام گاہ پہنچا دیا جائے گا۔ چیف ڈاکٹر نے جو مجھے پسند کرنے لگا تھا، ایک شام مجھے بتایا کہ اگر میں چاہوں تو رات دس بجے تک اپنا نام اس فہرست سے خارج کرا سکتا ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ میرا طریقہ نہیں ہے؛ میں خود کو قسمت کے حوالے کرتا ہوں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہی رہنا چاہوں گا۔ اس نے ہمدردانہ نظروں سے مجھے دیکھا، گویا وہ سب کچھ جانتا ہے... اس نے خاموشی سے میرا بازو ہلایا اور زندگی کیلئے نہیں، زندگی ہارنے کی طرف روانہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ وہاں مجھے میرا ایک اچھا دوست مل گیا جو میرا انتظار کر رہا تھا۔

''کیا تم واقعی ان کے ساتھ جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں، میں جا رہا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ پھر میں نے اپنی وصیت اسے سنائی:

''سنو میرے دوست اوٹو، اگر میں اپنی بیوی سے ملنے گھر نہ آ سکوں اور تم اسے مل لو تو اسے بتانا کہ میں روزانہ اس سے باتیں کرتا تھا، ہر لمحے۔ یہ بات یاد رکھنا۔ دوسرے، میں نے ہر شے سے زیادہ اُس سے محبت کی ہے۔ تیسرے، میں نے جب سے اس سے شادی کی ہے، وہ میرے لیے ہر چیز سے زیادہ اہم رہی ہے۔''

اوٹو، تم اب کہاں ہو؟ کیا تم زندہ ہو؟ ہماری گزشتہ ملاقات کے بعد کیا ہوا؟ کیا تم نے اپنی بیوی کو تلاش کر لیا؟ کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میری وصیت ضرور یاد

Scanned by CamScanner

رکھنا... لفظ بہ لفظ... خواہ تم بچوں کی طرح کتنا ہی روؤ دھوؤ؟"

اگلے صبح میں گاڑی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اس مرتبہ یہ چال نہیں تھی۔ ہم گیس چیمبر کی طرف نہیں جا رہے تھے بلکہ واقعی ریسٹ کیمپ ہی گئے تھے۔ جو لوگ کیمپ میں رہ گئے تھے اور مجھے ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، انھیں ہمارے نئے کیمپ کے مقابلے میں زیادہ قحط کا سامنا تھا۔ انھوں نے اپنی بقا کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی قسمتوں کو مہر بند کر چکے تھے۔ آزادی کے کئی ماہ بعد میں اپنے کیمپ کے ایک پرانے دوست سے ملا۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ انسانی لاشوں میں سے انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا غائب ہوگیا تو پولیس مین اس کی تلاش کر رہا تھا۔ اس نے یہ ٹکڑا ایک برتن میں سے برآمد کیا جو پکانے کیلئے رکھا گیا تھا۔ گویا، آدم خوری شروع ہو چکی تھی۔ میں اس دوران یہ جگہ چھوڑ چکا تھا۔

کیمپ کے قیدی فیصلے کرنے اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے لرزاں تھے۔ یہ اس قوی احساس کا نتیجہ تھا کہ قسمت فرد کی مالک ہے اور آدمی کو اسے بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مزید یہ کہ بے حسی بہت زیادہ تھی جس کا احساس قیدیوں کے محض چھوٹے حصے میں نہیں تھا۔ اس دوران کوئی بھی فیصلہ موت یا زندگی کا فیصلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ قیدی اپنی قسمت پر اپنے معاملات چھوڑنے کو ترجیح دیتے تھے۔ خاص کر جب ایک قیدی کو فرار کی کوشش کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوتا تو یہ چیز بہت ہی نمایاں ہوتی۔ ان لمحات میں، اس کے ذہن میں ہمیشہ ایک سوال ضرور گردش کرتا کہ اس جہنم میں وہ جس تکلیف کے دن گزار رہا ہے، کیا اسے یہاں سے فرار کی کوشش کرنی چاہیے؟ کیا اسے خطرہ لینا چاہیے؟

میں بھی اس عذاب کا تجربہ کر چکا تھا۔ جنگ کے دوران مجھے فرار کا موقع ملا تھا۔ میرا ایک قلیق جو طبی ذمے داریاں ادا کر رہا تھا، کیمپ سے باہر آیا اور وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا، اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ایک مریض کے معائنے کا بہانہ کر کے کہ جسے ماہرانہ

Scanned by CamScanner

مشورے کی ضرورت تھی، وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ کیمپ سے باہر ایک شخص تھا جس نے ہمیں یونیفارم اور دستاویزات فراہم کرنا تھیں۔ آخری لمحے، کچھ تیکنیکی مشکلات پیدا ہوگئیں اور ہمیں واپس کیمپ میں آنا پڑا۔ اس دوران ہمیں چند اشیائے ضروریہ مل گئیں... چند سڑے ہوئے آلو اور بوسیدہ تھیلے۔

ہم خواتین کے ایک کیمپ میں ٹھہرے جو خالی تھا اور یہاں کی خواتین کو دوسرے کیمپ بھیج دیا گیا تھا۔ اس کیمپ میں بہت سی چیزوں کی کمی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ بہت سی خواتین کو کئی چیزوں کی ضرورت تھی۔ چیتھڑے، سڑی ہوئی غذائیں اور ٹوٹے ہوئے برتن۔ بعض پیالے اب بھی بہتر حالت میں تھے اور ہمارے لیے اہم تھے لیکن ہم نے انھیں نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں لگا کہ جب حالات زیادہ مایوس کن ہوں گے تو انھوں نے انھیں نہ صرف غذا کیلئے بلکہ واش بیسن اور چیمبر پوٹ کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہوگا۔ (وہاں ایک قانون یہ بھی تھا کہ کوئی برتن باہر سے نہیں لایا جائے گا۔ تاہم بعض لوگوں کو بہ زور یہ قانون توڑنے کا کہا جاتا تھا، خاص کر ٹائیفائیڈ کے مریض جو اتنے کم زور ہوتے تھے کہ کسی کے سہارے بھی کیمپ سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔) میں باہر دیکھتا رہا اور میرا دوست جھونپڑے کے اندر داخل ہوگیا اور جلد ہی پشتی تھیلے کے ساتھ واپس لوٹا جو اُس نے اپنے کوٹ کے نیچے چھپالیا تھا۔ اس نے اندر ایک اور تھیلا بھی دیکھا تھا جو مجھے اٹھا کر لانا تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنی جگہیں بدلیں اور میں اندر چلا گیا۔ میں نے ان بے کار چیزوں میں تھیلا تلاش کرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ ہی مجھے ٹوتھ برش بھی مل گیا۔ اچانک مجھے ان چیزوں میں ایک عورت کی لاش بھی نظر آئی جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

میں دوڑ کر اپنے جھونپڑے میں پہنچا اور اپنی تمام چیزیں جمع کیں: میرا غذا کا پیالہ، ہتھ پوش جو مُردہ ٹائیفائیڈ کے مریض سے ملا تھا اور کاغذ کے ٹکڑے جو میں مختصر نکات لکھنے کیلئے استعمال کرتا تھا (جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ آشویٹز میں میرا تحقیقی مقالہ

Scanned by CamScanner

کھو چکا تھا)۔ میں نے تیزی سے اپنے مریضوں کا جائزہ لیا جو جھونپڑے کے دونوں جانب خستہ لکڑی کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے تھے۔ میں واحد ہم وطن کے پاس گیا جو قریب المرگ تھا اور میری خواہش تھی کہ اس کی اس حالت کے باوجود میں اس کی جان بچا سکوں۔ اب تک میری خواہش تھی کہ میں کسی طرح فرار ہو جاؤں، لیکن میرے ساتھی دیکھ رہے تھے کہ کچھ گڑبڑ ہے (غالباً اس وجہ سے کہ میں گھبرایا ہوا تھا)۔ تھکی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا، ''تم بھی باہر جا رہے ہو؟'' میں نے انکار کیا، لیکن اس کی اداسی کو نظر انداز کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ معائنہ سے واپس آ کر میں اس کی طرف دوبارہ گیا۔ اس نے مایوسانہ نظروں سے مجھے مبارک باد دی اور میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں سے فرار ہونے والا ہوں تو اس نے میرا ہاتھ دبوچ لیا۔ ایک ناخوش گوار احساس نے مجھے جکڑ لیا۔

اچانک میں نے اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ میں جھونپڑے سے باہر دوڑا اور اپنے دوست کو بتایا کہ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں نے اپنا ذہن بنا لیا کہ میں اپنے مریضوں کے ساتھ رہوں گا اور پھر اس ناخوش احساس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اگلے دنوں میں کیا ہونے والا ہے۔ لیکن میرے اندر سکون کا احساس جاگزیں تھا جو میں نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ میں جھونپڑے میں آیا، اپنے ہم وطن کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ پھر میں دوسروں کی طرف متوجہ ہوا اور انھیں خاموش کرانے کی کوشش کی جو مدہوشی میں بڑبڑا رہے تھے۔

کیمپ میں ہمارا آخری دن بھی آ گیا۔ جوں جوں جنگی حالت قریب آ رہی تھی، تقریباً تمام قیدیوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کے دوسرے کیمپوں میں لے جایا جا رہا تھا۔ کیمپ کی انتظامیہ، کیپو اور باورچی بھاگ چکے تھے۔ اس دوران اعلان کیا گیا کہ آج غروبِ آفتاب تک یہ کیمپ مکمل خالی کر دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ چند خاص قیدیوں (مریض، چند ڈاکٹر اور چند

Scanned by CamScanner

نرسیں) کو بھی جانا ہوگا۔ اس رات کیمپ کو جلایا جانا تھا۔ جس ٹرک نے مریضوں کو لے جانا تھا، سہ پہر تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کی بجائے کیمپ کے گیٹ اچانک بند کر دیے گئے تھے اور خاردار تاروں کی کڑی نگرانی جاری تھی تا کہ کوئی فرار کی کوشش نہ کرے۔ باقی ماندہ قیدیوں کو بہ ظاہر کیمپ کے جلنے تک یہاں ٹھہرنا تھا۔ اب، دوسری مرتبہ میں نے اور میرے دوست نے فرار کا فیصلہ کیا۔

ہمیں حکم دیا گیا کہ تین مُردوں کو باڑ سے باہر دفنا دیں۔ پورے کیمپ میں ہم دو میں اتنی قوت تھی کہ یہ کام کر سکیں۔ تقریباً تمام ہی بخار یا بے ہوشی کے باعث چند جھونپڑوں میں پڑے ہوئے تھے جو اَب تک زیرِ استعمال تھیں۔ اب ہم دونوں نے اپنا منصوبہ بنایا: پہلی لاش کے ساتھ ہم اپنے دوست کے تھیلے کو باہر نکالیں گے۔ اسے لانڈری ٹب میں چھپا دیں گے جو کفن رکھنے کیلئے تھا۔ جب ہم دوسری لاش باہر لائیں گے تو اُس کے ساتھ میرا تھیلا بھی لایا جائے گا۔ اور تیسرے پھیرے میں ہم فرار ہو جائیں گے۔ پہلے دو پھیرے منصوبے کے مطابق ہوئے۔ جب ہم واپس ہوئے تو میرے دوست نے روٹی کی تلاش شروع کر دی تا کہ جنگل میں چند روز کھانے کو تو ہمارے پاس کچھ ہو۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ منٹ گزرتے گئے۔ تین سال کی قید کے بعد میں آزادی کی منظر کشی کر رہا اور اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جنگی سرحد پر پہنچنا کتنا دل فریب ہوگا۔ لیکن ہم زیادہ دور نہیں جا سکے۔

اسی لمحے میرا دوست واپس آیا۔ کیمپ کے گیٹ اکھاڑ پھینکے گئے تھے۔ ایک شان دار ایلومینیم کلر کی کار جس پر بڑے بڑے ریڈ کراس بنے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ پریڈ گراؤنڈ میں چلتی ہوئی آئی۔ جنیوا سے ریڈ کراس کا بین الاقوامی وفد وہاں آ پہنچا تھا۔ اب کیمپ اور اس کے قیدی اس کی حفاظت میں تھے۔ ریڈ کراس کا عملہ قریب ہی قائم فارم ہاؤس میں موجود فوجی رہائش گاہ میں موجود تھا تا کہ وہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے دوران کیمپ تک فوری

Scanned by CamScanner

رسائی حاصل کر سکے۔ ایسے میں فرار کی فکر کون کرے گا؟ کار سے دواؤں کے ڈبے اتارے گئے۔ سگرٹ اتارے گئے اور تقسیم کیے گئے۔ ہماری تصاویر لی گئیں اور شاہانہ ٹھاٹھ شروع ہو گئے۔ اب ہمیں کیمپ سے فرار اور جنگی سرحد تک پہنچنے کا خطرہ لینے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

اپنی خوشی میں ہم تیسری لاش کو بھول گئے، لہٰذا ہم نے اسے اس تنگ قبر میں پھینک دیا جو ہم نے تینوں لاشوں کیلئے کھودی تھی۔ ہمارے ساتھ جو محافظ تھا، پہلے ہی نسبتاً غیر جارحانہ تھا، اب تو بالکل ہی شریف بن گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ پانسا پلٹ چکا ہے تو ہماری آشیرباد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مُردہ لوگوں کیلئے ہم نے دعا کی تو وہ اس میں شریک ہوا۔ اس کے بعد ہم نے گڑھے پر مٹی ڈال دی۔ ماضی کے کئی ایام کے تناؤ کے بعد جو ہم نے موت سے مقابلے میں گزارے، اب ہمارے لبوں پر امن کی دعائیں تھیں جو یقیناً ہر انسان کی زبان پر ہو سکتی ہے۔

کیمپ میں آخری دن آزادی کے جشن میں گزرا۔ یہ خوشی بہت جلد پوری ہو گئی۔ ریڈ کراس کے وفد نے ہمیں بتایا کہ ایک معاہدے پر دستخط ہونے والے ہیں اور ابھی کیمپ سے انخلا نہیں ہوگا۔ لیکن اسی رات شودا ستافل ایک ٹرک سمیت وہاں آ پہنچے اور انھوں نے ہمیں کیمپ صاف کرنے کا حکم دیا۔ آخری قیدی کو مرکزی کیمپ لے جایا گیا جہاں سے اسے اگلے اڑتالیس گھنٹے میں سوئٹزرلینڈ لے جایا جانا تھا اور اس کے بدلے دیگر جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہونا تھا۔ ہمارے لیے شودا ستافل کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہ بہت ہی دوستانہ مزاج رکھتے تھے اور ہمیں بغیر کسی ڈراوے دھمکاوے کے ٹرک میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ باور کرا رہے تھے کہ ہمارا یہ سفر ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ جو لوگ قوی تھے، وہ تو اچھی طرح کھڑے ہو گئے، لیکن بیمار اور ضعیف افراد بہ مشکل ٹرک میں چڑھنے اور سنبھلنے کے قابل تھے۔ میں نے اور میرے دوست نے اب اپنے تھیلے نہیں چھپائے اور آخری گروہ میں کھڑے ہو گئے جس میں سے تیرہ افراد کو اس آخری ٹرک کیلئے منتخب کیا جانا تھا۔ چیف

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر نے مطلوبہ تعداد کی گنتی کی اور ہم دونوں کو یہاں سے باہر نکال دیا۔ تیرہ افراد کو ٹرک میں سوار کر دیا گیا اور ہمیں یہیں چھوڑ دیا گیا۔ حیران کن طور پر اور مایوسانہ انداز میں ہم نے چیف ڈاکٹر پر الزام تراشی کی جس نے بعد میں معذرت بھی کی اور کہا کہ وہ تھکا اور پریشان تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم اب بھی فرار کی کوشش میں ہیں۔ بے صبری کے ساتھ ہم نیچے بیٹھ گئے۔ ہمارے تھیلے اب بھی ہماری پیٹھوں پر لدے ہوئے تھے۔ ہم چند بقیہ قیدیوں کے ساتھ آخری ٹرک کا انتظار کرنے لگے۔ ہمیں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ تھکے ہارے ہم محافظوں کے کمرے میں جا لیٹے۔ اس وقت ہم خوشی اور بے چینی کی متضاد کیفیات میں گرفتار تھے اور آخری چند ساعتوں کے ختم ہونے کے منتظر۔ ہم وہی کپڑے اور جوتے پہنے پہنے سو گئے، گویا، سفر کیلئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

بندوقوں اور توپوں کی آواز سے ہم اٹھے۔ گولیاں جھونپڑے کے اندر آ رہی تھیں۔ چیف ڈاکٹر نے ہمیں فرش پر لیٹ جانے کو کہا۔ بدحواسی میں ایک قیدی جوتوں سمیت اپنے بستر سے کودا اور میرے پیٹ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی وجہ سے میری بھی آنکھ کھل گئی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جنگ اس علاقے تک پہنچ چکی تھی۔ گولہ باری کم ہوئی اور صبح طلوع ہوئی۔ کیمپ کے گیٹ کے ستون پر ایک سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کئی ہفتے بعد ہمیں لگا کہ ان دنوں قسمت ہمارے ساتھ کھیل کھیل رہی تھی۔ ہمیں پتا لگا کہ انسانی فیصلے کتنے غیر یقینی ہوتے ہیں، خاص کر جب معاملہ زندگی اور موت کا ہو۔ ہماری تصاویر ایک چھوٹے سے کیمپ میں کھینچی گئیں جو ہم سے بہت دور نہیں تھا۔ ہمارے وہ دوست جنہیں ٹرک پر لے جایا گیا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اس رات انھیں آزادی مل جائے گی، انھیں دوسرے مقام پر لے جا کر ایک جھونپڑے میں بند کر دیا گیا اور پھر جلا کر مار دیا گیا۔ اُن کی مسخ لاشوں کی شناخت تصویر سے ہو سکتی تھی۔

اس دفاعی میکانزم سے قطع نظر، قیدیوں کی بے حسی دیگر کئی عوامل کا نتیجہ بھی تھی۔ بھوک

Scanned by CamScanner

اور نیند کی کمی بھی ان عوامل میں شامل تھی (جو عام زندگی میں بھی ہوتی ہے)۔ نیز، عمومی چڑچڑا پن قیدیوں کی اس ذہنی کیفیت کا ایک اور سبب تھا۔ نیند کی کمی کا سبب وہ کیڑے مکوڑے تھے جو رات کو تنگ کرتے تھے، کیوں کہ کیمپ میں صحت وصفائی کے انتظامات بالکل مفقود تھے۔ ہمیں نکوٹین اور کیفین بھی فراہم نہیں کی جاتی تھی، لہٰذا ان دونوں کی کمی بھی بے حسی اور چڑچڑے پن کا ذریعہ تھی۔

ان جسمانی اسباب کے علاوہ چند ذہنی عوامل بھی اس کا باعث تھے۔ ہم سے گاہے گاہے کسی بے جان شے کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہم کوئی منحوس شے تھے۔ (انسان کی اندرونی قدر کا ادراک بلند اور اعلا روحانی شے ہے اور اسے کیمپ کی وحشت ناک زندگی سے چھینا نہیں جاسکتا تھا۔ لیکن کتنے آزاد لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے) شعوری طور پر اس بارے میں سوچے بغیر، اوسط قیدی خود کو ذلیل تصور کرتا تھا۔ لیکن جو قیدی زیادہ نمایاں ہوتے... کیپو، باورچی، اسٹور کیپر اور کیمپ پولیس اہل کار... خود کو قانونی طور پر گھٹیا اور ذلیل نہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ چند لوگ ہی تھے جنھیں ترقی دے کر یہاں لایا جاتا، اکثریت ایسی نہیں تھی۔ بعض قیدی دوسروں کے آرام کو دیکھ کر فریب ذہنی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یہ اُن میں موجود حسد کے ردِعمل کا ایک انداز تھا۔ چنانچہ اکثریت جب قلیل تعداد میں افراد کو دیکھتی تو وہ مختلف انداز سے اپنے ذہنی ردِعمل کا اظہار کرتی جو کبھی لطیفوں کی شکل میں بھی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، ایک عام قیدی کو میں نے دوسرے قیدی سے ایک کیپو کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنا کہ دیکھو، میں اس آدمی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ ایک بڑے بینک کا صدر تھا۔ دیکھو، یہ دنیا کا خوش قسمت انسان ہے کہ ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہے۔

جب کبھی پست تر اکثریت اور بالاتر اقلیت کسی جھگڑے کی صورت میں آمنے سامنے ہوتے تو نتیجہ بہت ہی بھیانک ہوتا۔ ایسے مواقع اکثر ہی پیش آتے تھے، خاص کر غذا کی تقسیم کے دوران۔ چنانچہ عمومی چڑچڑا پن (جس کے ظاہری اسباب پہلے ذکر کیے جاچکے

Scanned by CamScanner

ہیں) اس وقت بہت ہی شدید ہو جاتا کہ جب اس میں ذہنی تناؤ بھی شامل ہو جاتا۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ یہ تناؤ آگے بڑھ کر دنگے فساد میں بدل جاتا۔ اگر قیدی کسی سے مار پیٹ کرتے تو اُن پر تشدد کہیں بڑھ جاتا۔ میں بھی جب تھکا ہوا اور بھوکا ہوتا تو میرا غصہ کہیں بڑھ جاتا اور اسے کنٹرول کرنے کیلئے میں عموماً زور سے اپنے ہاتھوں کو بھینچتا۔ میں عموماً بہت تھک جاتا تھا، کیوں کہ ہمیں ٹائیفائیڈ کے مریضوں کیلئے رات بھر چولھا جلا کر رکھنا پڑتا تھا۔ تاہم، آدھی رات کا وہ پہر پھر بھی غنیمت ہوتا کہ جب بیش تر مریض سوئے ہوتے یا نیم غشی کی حالت میں ہوتے۔ اس وقت میں اکثر چولھے کے سامنے لیٹ جاتا اور چوری کے چند آلوؤں کو چوری کے کوئلوں پر بھونتا۔

لیکن اس دن میں کہیں زیادہ تھکن، حساسیت اور چڑچڑا پن محسوس کر رہا تھا۔ جب میں ٹائیفائیڈ بلاک میں بہ طور ڈاکٹر کام کر رہا تھا، مجھے اس بلاک کے وارڈن کی جگہ بھی کام کرنا پڑا جو خود بیمار تھا۔ چنانچہ جھونپڑے کو صاف رکھنا میری ذمے داری تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں صفائی کا مقصد اس جگہ کو صاف ستھرا رکھنے سے زیادہ تشدد کیلئے تیار رکھنا تھا۔ زیادہ کھانا اور کچھ دوائیں مددگار ہوتی تھیں۔ لیکن انسپکٹر کی توجہ اس بات پر ہوتی کہ آیا مرکزی گزرگاہ میں سوکھی گھاس رکھی گئی ہے اور کیا پھٹیچر کمبل تہہ کر کے مریضوں کے پیروں تلے رکھ دیے گئے ہیں۔

جہاں تک قیدیوں کی قسمت کا معاملہ ہے، وہ اس سے بالکل بے پروا تھے۔ میں جب انھیں پکارتا تو وہ بالکل مطمئن ہوتے۔ اکثر کئی کئی گھنٹے تاخیر سے پہنچتے اور بعض اوقات آتے ہی نہیں تھے۔ مجھے تاکید تھی کہ میں کمبل سیدھے رکھوں، جو تنکے گر چکے ہیں انھیں اٹھالوں اور اُن مظلوم بدمعاشوں پر چلاتا رہوں جو اپنے بستروں پر پڑے ہوئے ہیں اور صفائی ستھرائی کی تمام تر کوششوں کو ملیامیٹ کر رہے ہیں۔ بخار میں مبتلا مریضوں میں بے حسی زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ جب تک ان پر چلایا نہ جاتا، وہ کوئی جواب نہ دیتے۔ بعض اوقات یہ تدبیر بھی

Scanned by CamScanner

کارگر نہ ہوتی اور اس لمحے شدید کنٹرول کی ضرورت ہوتی کہ انھیں زدوکوب نہ کیا جائے۔ دوسرے کی بے حسی کا خمیازہ اپنے چڑچڑے پن کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا، خاص کر جب انسپکشن ہوتا اور کوئی خطرہ پیدا ہوسکتا تھا۔

حراستی کیمپ کے قیدی کے ایسے نفسیاتی ردِعمل کے بارے میں یہ کہوں گا کہ آدمی مکمل طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اس تناظر میں چونکہ کیمپ کا ماحول بہت ہی عجیب تھا، یہاں کے قیدی بھی منفرد مزاج اور انداز کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن، انسان کی آزادی کے بارے میں کیا کہیے۔ کیا اردگرد کے ماحول میں آدمی کو کسی قسم کی روحانی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنے برتاؤ اور ردِعمل کا اظہار کر سکے؟ کیا یہ نظریہ درست نہیں کہ انسان اپنے ماحولی عوامل اور اثرات کا مصنوعہ ہوتا ہے... یہ عوامل حیاتی ہوں، نفسیاتی یا معاشرتی؟ کیا انسان ان عوامل کی ایک اتفاقی مصنوعہ ہے؟ سب سے اہم یہ کہ وہ قیدی جو اس حراستی کیمپ میں تھے، وہ اس شدید دنیا کے عوامل اور اس کے اثرات سے خود کو آیا بچا نہیں سکتے تھے؟ کیا ایسے حالات میں آدمی کے پاس عمل کا کوئی اختیار نہیں؟

ہم اپنے تجربات اور بعض اصولوں کی روشنی میں ان سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں۔ کیمپ کی زندگی کے تجربات بتاتے ہیں کہ انسان کے پاس بہ ہر حال عمل کا انتخاب ہوتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی بے حسی پر قابو پایا جاسکتا ہے اور چڑچڑے پن کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ آدمی اپنی روحانی آزادی کو، اپنی ذہنی خودانحصاری کو محفوظ رکھ سکتا ہے... خواہ کتنے ہی نفسیاتی اور جسمانی دباؤ والے مشکل حالات ہوں۔

ہم لوگ جو حراستی کیمپ میں رہ رہے تھے، ایسے افراد کو بھول نہیں سکتے جو جھونپڑوں میں اِدھر اُدھر گھومتے تھے اور دوسروں کو تسلی دیتے تھے، حتیٰ کہ اپنی روٹی کا آخری ٹکڑا بھی انھیں دے دیتے تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ انسان سے سب کچھ چھینا جاسکتا ہے، مگر انسان کی آزادی نہیں چھین

Scanned by CamScanner

سکتے۔ انسان کی آزادی... کیسے ہی حالات ہوں، آدمی کا یہ رویہ ہو کہ وہ ان حالات میں اپنے راستے کا انتخاب خود کر سکتا ہے۔

اور، وہاں بھی یہ انتخاب ہمیشہ موجود تھا۔ ہر دن، ہر ساعت ہمیں یہ موقع فراہم کرتی کہ ہم فیصلہ کریں... فیصلہ کہ آیا ہم ان ڈراؤنی قوتوں کے حوالے خود کو کر دیں گے کہ وہ ہماری ذات اور ہماری اندرونی آزادی کو سبوتاژ کر دیں یا پھر ان کا مقابلہ کریں گے۔ اگر آپ اپنی آزادی اور وقار سے سبک دوش ہو جائیں گے تو ٹھیٹھ قیدی بن جائیں گے۔

اس زاویہ نظر سے دیکھیں تو حراستی کیمپ میں قیدیوں کا ذہنی ردِعمل ہمیں مخصوص جسمانی یا نفسیاتی کیفیت کے اظہار سے زیادہ اہم دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ چند کیفیات جیسے نیند کی کمی، ناکافی غذا اور مختلف قسم کے ذہنی کرب سے یہ پتا چلتا ہے کہ قیدی مخصوص قسم کے ردِعمل ہی کر سکتے تھے، البتہ حتمی تجزیے میں یہ واضح ہوا کہ جو فرد بھی جس قسم کا قیدی بنا، اس کا انحصار اُس کے اندرونی فیصلے کا نتیجہ تھا، نہ کہ حراستی کیمپ کے عوامل کے اثرات کے باعث وہ ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک آدمی چاہے کیمپ جیسے خطرناک حالات ہی کیوں نہ ہوں، یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے کہ وہ کیا بنے گا... ذہنی اور روحانی طور پر۔

دوستوفسکی نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''میں صرف ایک شے سے ڈرتا ہوں: میں اپنی تکالیف سے قابل قدر فائدہ نہ اٹھا پاؤں۔'' یہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں آئے کہ جب میں کیمپ میں ہلاک ہونے والے افراد کے برتاؤ سے واقف ہوا کہ انھوں نے ان تمام تر مشکلات اور مسائل کے باوجود اپنی اندرونی آزادی کو کھونے نہیں دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تکالیف سے زیادہ قوی ہیں اور جس انداز سے اپنی تکالیف کو ختم کرتے ہیں، وہ ان کی اندرونی کامیابی ہے۔ یہ دراصل روحانی آزادی ہے جو کسی سے چھینی نہیں جا سکتی... اور یہی زندگی کو بامفہوم اور بامقصد بناتی ہے۔

ایک متحرک زندگی کے ذریعے آدمی کو تخلیقی کام کی قدر محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے،

Scanned by CamScanner

جبکہ مجرد زندگی جس میں آرام اور مزہ ہو، حُسن، آرٹ اور فطرت سے لطف اٹھانے کے قابل کرتی ہے۔ لیکن صرف تخلیقیت اور لطف ہی بامفہوم نہیں ہوتے۔ اگر ہر شے کا کوئی نہ کوئی مطلب اور مقصد ہے تو پھر ہماری تکالیف کا بھی کوئی مفہوم اور مقصد ہونا چاہیے۔ تکالیف زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ تکالیف اور موت کے بغیر انسانی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔

آدمی جس انداز سے اپنی قسمت اور تکالیف کو قبول کرتا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ وہ جس انداز سے اِن سے گزرتا ہے، وہ انداز اسے مواقع بخشتا ہے۔ حتیٰ کہ سخت ترین حالات میں بھی اسے زندگی کا مفہوم اور مقصد مل سکتا ہے۔ وہ بہادر، باعظمت اور غیر خود غرض ہوتا ہے۔ چنانچہ سخت ترین مقابلے میں بھی وہ اپنی شناخت نہیں بھولے گا اور حیوان نہیں بنے گا۔ یہاں اس کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنی اَخلاقی اقدار کو باقی رکھتا ہے یا پس انداز کر ڈالتا ہے۔ اور اس سے پتا چلتا ہے کہ آیا وہ اپنی تکالیف سے اہم تر ہے یا نہیں۔

یہ نہ سوچئے کہ یہ تمام باتیں غیر حقیقی ہیں اور عملی زندگی سے بہت دور۔ البتہ یہ بات سچ ہے کہ بہت کم لوگ اس اخلاقی معیار تک پہنچ پاتے ہیں۔ چند ہی قیدی اپنی اندرونی آزادی بحال رکھ پاتے تھے اور اپنی تکالیف سے پیش آنے والی اقدار کا سامنا کرتے تھے۔

یہ چند مثالیں یہ باور کرانے کیلئے کافی ہیں کہ آدمی کی اندرونی قوت اسے بیرونی قسمت سے بالاتر کر سکتی ہے۔ ایسے افراد صرف حراستی کیمپ ہی میں نہیں تھے۔ ہر سمت ہر انسان کو اپنی قسمت کا سامنا ہے اور ساتھ ہی تکالیف کے ذریعے کچھ بڑا حاصل کرنے کے مواقع بھی دست یاب ہیں۔

بیماروں کا معاملہ لیجیے... خاص کر وہ جو نا قابل علاج ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک نوجوان کا خط پڑھا جو اُس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے بتایا کہ وہ اب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکے گا، حتیٰ کہ آپریشن سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس نے لکھا کہ اسے ایک فلم یاد ہے جو اُس نے بہت پہلے دیکھی تھی جس میں ایک آدمی کو دکھایا گیا تھا جو

Scanned by CamScanner

بڑی دلیری اور عظمت سے اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لڑکے نے سوچا کہ اپنی موت کو اس انداز سے گلے لگانا بڑی بات ہوگی۔ پھر اس نے لکھا کہ میری قسمت مجھے وہی موقع دے رہی ہے۔

جن لوگوں نے فلم ''ری سریکشن'' دیکھی ہے، جو ٹالسٹائی کی کتاب سے ماخوذ ہے، اسی خیال پر مبنی ہے۔ یہ وہ عظیم لوگ تھے۔ ہمارے لیے اس وقت کوئی عظیم قسمت نہیں تھی۔ یہ عظمت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

فلم دیکھنے کے بعد ہم قریبی کیفے گئے اور ہم نے پے در پے کوفی کے کئی کپ اور سینڈوچ ہضم کر ڈالے۔ ہم یہ بھول چکے تھے کہ ہم ایک انوکھے مابعد طبیعیاتی خیال سے گزر رہے ہیں اور اس وقت ہم اسی میں گرفتار تھے۔ لیکن جب ہمیں عظیم مقصد کا سامنا کرنا پڑا اور روحانی عظمت سے سابقہ پڑا تو ہم اپنے اُن خوابوں کو بھول گئے جو ہم نے کبھی جوانی میں دیکھے تھے۔

اور غالباً ایک دن ہماری زندگی پھر آیا کہ جب ہم نے وہ فلم دوبارہ دیکھی یا پھر اس سے ملتی جلتی فلم۔ لیکن تب سے دیگر تصویریں یکے بعد دیگر آدمی کی اندرونی آنکھ سے گزرتی رہیں: لوگوں کی تصویریں جنھوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا اور ایک فلم اسے جذباتی منظر کے طور پر جیسے پیش کر سکتی ہے۔ ایک مخصوص آدمی کی اندرونی عظمت جو کسی کی آنکھ میں سما سکتی ہے، جیسے اس عورت کی کہانی جس کی موت میں نے حراستی کیمپ میں دیکھی۔ یہ سادہ کہانی ہے۔ یہ بہت مختصر کہانی ہے اور میں بتاؤں گا تو لگے گا کہ میں نے گڑھی ہے، بلکہ شاعری لگتی ہے۔

یہ نوجوان خاتون جانتی تھی کہ وہ اگلے چند روز میں مر جائے گی۔ لیکن جب میں نے اس سے بات کی تو وہ یہ جاننے کے باوجود خوش تھی۔ اس نے کہا، ''میں اس پر شکر گزار ہوں کہ قسمت نے مجھے اتنے سخت مصائب میں رکھا۔ میری سابقہ زندگی بہت خراب گزری ہے

Scanned by CamScanner

اور میں نے اس روحانی کارنامے کو اتنا سنجیدہ نہیں لیا تھا۔" اپنی جھونپڑے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا، "یہ درخت میری اس تنہائی میں میرا واحد دوست ہے۔" اس کھڑکی سے باہر وہ شاہ بلوط کے درخت کی ایک شاخ دیکھ سکتی تھی۔ اور، اس شاخ پر صرف پھول تھے۔ اس نے بتایا کہ "وہ اکثر اس درخت سے باتیں کرتی ہے۔ میں اس کی بات سے چونک گیا اور سمجھ نہیں پایا کہ اس کا کیا مطلب نکالوں۔ کیا بے سدھ ہے؟ کیا اسے موقع بے موقع دورے پڑتے رہتے ہیں؟ میں نے حیرانی سے اس سے پوچھا، "کیا یہ درخت جواب دیتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اس سے کیا کہتا تھا؟ اس نے مجھے بتایا کہ "میں یہاں ہوں... میں یہاں ہوں... میں زندگی ہوں... ابدی زندگی۔"

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قیدیوں کی اندرونی ذاتی کیفیت ان کی نفسی جسمی عوامل کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اُن کے آزاد فیصلوں کا نتیجہ تھی۔ قیدیوں کے نفسیاتی مشاہدوں سے پتا چلا کہ جن افراد نے خود کو اپنی اخلاقی و روحانی ذات کی اندرونی گرفت کو کیمپ کے پست انگیز اثرات کے حوالے کر دیا، وہی یہاں کے ماحول کا نشانہ بنے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اندرونی گرفت کس شے پر مشتمل ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیے؟

سابق قیدیوں نے جب اپنے تجربات لکھے تو انھوں نے یہ بتایا کہ ایک قیدی کیلئے سب سے زیادہ مایوسانہ عامل یہ تھا کہ انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ شدید حالات کب تک جاری رہیں گے۔ ان کے پاس اپنی خلاصی کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ ہمارے کیمپ میں تو اس پر بات کرنا ہی بے سود تھا۔ دراصل، قیدی کی اصطلاح نہ صرف غیر یقینی تھی، بلکہ غیر محدود تھی۔ ایک محقق ماہر نفسیات نے حراستی کیمپ کی زندگی کے بارے میں کہا کہ اسے "عبوری وجود" کہا جا سکتا ہے۔ ہم اس میں یہ اضافہ کریں گے کہ یہ "لامحدود حد کا عبوری وجود" تھا۔

نئے آنے والے افراد کیمپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ جو لوگ دوسرے کیمپوں سے واپس آتے تھے، انھوں نے خاموش رہنے کی ٹھانی تھی۔ اور بعض کیمپوں سے

Scanned by CamScanner

کوئی بھی نہیں لوٹا تھا۔ جو مرد کیمپ میں داخل ہوتے تھے، ان کے ذہنوں میں ایک نمایاں تبدیلی ہوتی تھی۔ غیر یقینیت کے خاتمے کے ساتھ انھیں خاتمے کی غیر یقینی ہوتی تھی۔ یہ پیشین گوئی کرنا ممکن نہ تھا کہ آیا وجود کا خاتمہ ہوگا یا نہیں، اور ہوگا تو کب ہوگا۔

لاطینی لفظ finis کے دو معنی ہیں: سرا، یا اختتام۔ جو آدمی اپنے 'عبوری وجود' کا سرا نہ دیکھ سکا، وہ زندگی میں حتمی ہدف بنانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ مستقبل دیکھنے کیلئے مقید کر دیا گیا جسے عام زندگی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی اندرونی زندگی کا پورا ڈھانچا بدل جاتا۔ زندگی کے بیش تر شعبوں میں بگاڑ کی علامات ظاہر ہونے لگتیں۔ جو لوگ ملازم نہ ہوتے، اُن کا وجود عبوری ہوتا اور ایک طرح سے وہ مستقبل یا مقصد کو سامنے نہ رکھ پاتے۔ تحقیق کا کام اُن غیر ملازموں پر کیا جاتا جو مخصوص قسم کے برے وقت سے گزر رہے ہوں... اندرونی وقت... جو اُن کی غیر ملازمانہ کیفیت کا نتیجہ ہے۔

قیدی بھی اس اجنبی ''وقت کے تجربے'' سے گزرتے۔ کیمپ میں، چھوٹا سا دورانیہ بھی بعض اوقات (مثلاً دن میں ایک مرتبہ ایک گھنٹے کا تشدد اور تھکن) بہ ظاہر نہ ختم ہونے والا بن جاتا۔ اس کے برخلاف، طویل دورانیہ مثلاً ایک ہفتہ بہت تیزی سے گزر جاتا۔ کیمپ کے میرے ساتھی میری اس بات سے متفق تھے کہ ایک دن ایک ہفتے کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے۔ وقت کا یہ تجربہ کتنا متضاد ہے! یہ نکتہ تھامس مان کی کتاب ''دی میجک ماؤنٹین'' کی یاد دلاتا ہے جس میں مصنف نے بعض ایسے نفسیاتی نکات بیان کیے ہیں۔ مان نے اس سے ملتی جلتی نفسیاتی کیفیات میں مبتلا مریضوں (جیسے سینی ٹوریم میں زیر علاج تپ دق کے مریض) کی روحانی نمو کا مطالعہ کیا۔ یہ مریض بھی نہیں جانتے تھے کہ انھیں کب یہاں سے گھر بھیجا جائے گا۔ وہ بھی اپنے وجود کا کچھ ایسا ہی تجربہ کرتے... نہ کوئی مستقبل اور نہ کوئی ہدف۔

ایک قیدی جس نے اسٹیشن سے کیمپ آنے کے بعد نئے قیدیوں کے ساتھ مارچ کیا،

Scanned by CamScanner

بعد میں مجھے بتایا کہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے جنازے میں شامل ہے۔ اسے اپنی زندگی کا قطعاً کوئی مستقبل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ عدم حیات کا یہ احساس دیگر عوامل کے باعث بڑھ جاتا ہے: وقت میں، وقت کا عدم وجود جو قید کی حالت میں ہوتا ہے؛ خلا میں، جیل کی تنگ حدود میں۔

خاردار تاروں سے دوسری جانب کی ہر شے بہت دور لگتی تھی، اپنی پہنچ سے کوسوں دور۔ گویا، وہ کوئی غیر حقیقی دنیا ہے۔ یہاں سے باہر کے لوگ جو عام زندگی گزار رہے تھے، قیدیوں کو بھوت تصور کرتے تھے۔ باہر کی دنیا کے لوگ جو زیادہ سے زیادہ کیمپ کے اندر کی دنیا کو سمجھ سکتے تھے، یہی تھا کہ وہ مُردہ لوگ ہیں جو دوسری دنیا میں جھانک رہے ہیں۔

جو آدمی اپنے مستقبل کے اہداف نہ دیکھ سکتا ہو، وہ خود کو زوال کے حوالے کر دیتا اور ماضی کے خیالات میں کھویا رہتا۔ ماضی کو دیکھنے کا ایک اور انداز بھی ہم بیان کر چکے ہیں جو حال کو بہتر بنانے کیلئے تھا۔ اس میں بھی وحشت زیادہ تھی اور حقیقت کم۔ لیکن حال میں سے اس کی حقیقت چرانے میں بھی خطرہ تھا۔ کیمپ کی زندگی کو مثبت بنانے کیلئے کئی مواقع نظر انداز کر دینا آسان تھا۔ مواقع جو واقعی موجود تھے۔ ''عبوری وجود'' کے تناظر میں، کہ جو بہ ذاتہ غیر حقیقی تھا، قیدیوں کو اُن کی زندگی پر گرفت کمزور کرنے کا سب سے قوی عامل تھا۔ چنانچہ ایک طرح سے ہر شے فضول ہو جاتی تھی۔ ایسے افراد یہ بھول جاتے تھے کہ اکثر یہ بیرونی حالت اپنی نمو کے اعتبار سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ کیمپ کی مشکلات کو اپنی اندرونی قوہ کی آزمائش کے طور پر لینے کی بجائے وہ اسے بہت ہی سنجیدگی سے لیتے اور یوں انھیں زندگی میں سب کچھ بے نتیجہ لگتا۔ وہ یہ زیادہ پسند کرتے کہ آنکھیں بند کریں اور ماضی میں چلے جائیں۔ ایسے افراد کیلئے زندگی بے مقصد اور بے مفہوم ہو جاتی تھی۔

فطری طور پر، چند لوگ ہی عظیم روحانی بلندیوں تک پہنچنے کے قابل ہوتے۔ بلکہ چند ہی اپنی ظاہری دنیاوی ناکامی اور موت کے باوجود انسانی عظمت کا موقع پاتے۔ ان کیلئے

Scanned by CamScanner

موت زندگی کا اختتام نہ ہوتی، بلکہ اس سے انھیں ایسی کامیابی ملتی جو عام حالات میں اُن کیلئے کبھی ممکن نہ ہوتی۔ ہم میں سے دیگر چھوٹے دل اور اوسط مزاج کے مالک تھے جن کے نزدیک زندگی ماہر دنداں کے پاس جانے کی طرح تھی کہ ابھی بدترین ہونے والا ہے، حالانکہ وہ تو کب کا گزر چکا۔ بہ الفاظِ دیگر، حراستی کیمپ کے زیادہ تر مرد یہ سمجھتے کہ زندگی کے حقیقی مواقع تو گزر چکے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہاں موقع بھی تھا اور چیلنج بھی۔ آدمی اندرونی عظمت میں روح پھونک کر اِن تجربات پر فتح پا سکتا تھا۔ یا پھر، اس چیلنج کو نظر انداز کر کے گزارا کرتا جیسے قیدیوں کی اکثریت کر رہی تھی۔

کیمپ میں بعض قیدیوں نے جبلی طور پر نفسی جسمی اثرات سے مقابلے کی کوشش کی۔ بعض افراد اپنے لیے مستقبل تلاش کرتے ہوئے ہی جی سکتے ہیں۔ اور یہ سخت ترین حالات میں اُن کے وجود کی آزادی ہوتی ہے۔ اگرچہ انھیں بعض اوقات اپنے ذہن کو اس جانب لگانے کیلئے سخت تگ ودَو کرنی پڑتی ہے۔

مجھے اپنا ایک ذاتی تجربہ یاد ہے۔ میں اس وقت درد سے رو رہا تھا، کیوں کہ پھٹے ہوئے جوتے پہننے کی وجہ سے میرے پیروں میں سخت پھوڑے ہو گئے تھے۔ ایسی حالت کے ساتھ میں اپنے کیمپ سے کام کی جگہ تک چند کلومیٹر تک لنگڑاتا ہوا چلا۔ سخت ٹھنڈ تھی۔ تیز ہوا تھپیڑے مار رہی تھی۔ میں پُر مشقت زندگی کے نہ ختم ہونے والے چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج رات کیا کھانا ہے؟ اگر راشن میں گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی آ گیا تو کیا مجھے یہ روٹی سے تبدیل کر لینا چاہیے؟ کیا مجھے اپنی آخری سگرٹ لے لینا چاہیے جو میں نے پندرہ روز پہلے بونس کے طور پر حاصل کی تھی؟ مجھے تار کا چھوٹا سا ٹکڑا کہیں مل سکتا ہے تا کہ میں اسے اپنے جوتے کے تسمے کے طور پر استعمال کر سکوں؟ کیا میں وقت پر کام کی جگہ پہنچ سکوں گا تا کہ اپنی معمول کی پارٹی کے ساتھ شامل ہو سکوں یا مجھے دوسری جماعت کے ساتھ کام کرنا ہوگا؟ زیادہ ظالم فورمین کون ہو سکتا ہے؟ کیپو کے ساتھ

اچھے تعلقات بنانے کیلئے میں کیا کرسکتا ہوں جو مجھے تکلیف دہ مارچ کی جگہ اپنے کیمپ میں کام کرنے کی اجازت دے دے؟

میرے ذہن میں ہر گھنٹے، ہر دن جو معاملات چل رہے تھے، میں اُن سے بیزار آچکا تھا حالانکہ یہ بہت ہی معمولی چیزیں تھیں۔ میں اپنے خیالات کو دوسری طرف لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میں نے خود کو ایک روشن، گرم اور خوش گوار لیکچر روم میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ میرے سامنے آرام دہ کرسیوں پر مخاطبین بیٹھے تھے اور وہ میری طرف ہمہ تن گوش تھے۔ میں انھیں حراستی کیمپ کے بارے میں نفسیات پر ایک لیکچر دے رہا تھا۔ یوں، میں خود اس صورتِ حال، اس لمحے کی تکلیف سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں اس وقت یہ سب ایسے دیکھ رہا تھا گویا یہ سب ماضی میں ہو چکا ہے۔ میں اور میری مشکلات دونوں ہی میری سائنسی تحقیقات کا موضوع بن چکی ہیں۔

وہ قیدی جو مستقبل کے بارے میں اپنا اعتقاد کھو بیٹھے تھے، یعنی اپنا مستقبل... وہ برباد ہو گئے۔ مستقبل پر یقین کھونے سے اُن کی روحانی گرفت بھی کم زور پڑ چکی تھی۔ انھوں نے خود کو زوال پذیر ہونے دیا اور اپنے ذہنی اور جسمانی زوال کا ہدف بن گئے۔ عموماً یہ سب ایک بحران کی صورت میں اچانک ہوتا۔ اس کی علامات بھی کیمپ کے قیدیوں میں یکساں تھیں۔ ہم سب اس لمحے سے ڈرتے تھے... اپنے لیے نہیں... اپنے دوستوں کیلئے کہ کب اُن کیلئے سب کچھ فضول ہو جائے گا۔ عام طور پر اس کا آغاز اس طرح ہوتا کہ قیدی صبح کپڑے پہننے اور غسل کرنے سے انکاری ہو جاتا اور مارچ کیلئے باہر نہ نکلتا۔ نہ کوئی گزارش، نہ زدوکوب، نہ کوئی دھمکی... کچھ بھی اثر نہ کرتا۔ وہ وہاں لیٹا رہتا اور بے سدھ پڑا رہتا۔ اگر یہ ذہنی بحران بیماری کے ساتھ آتا تو وہ بیماروں کے کمرے میں جانے اور کسی قسم کی مدد لینے کیلئے بھی تیار نہ ہوتا۔ سادہ طور پر یہ کہیے کہ وہ ہمت ہار بیٹھتا۔ وہ اپنی جگہ پڑا رہتا اور کوئی بھی شے اسے یہاں سے ٹس سے مس نہیں کر سکتی تھی۔

Scanned by CamScanner

میں نے ایک مرتبہ مستقبل پر یقین کھونے اور ہمت چھوڑنے کا خطرناک مظاہرہ دیکھا تھا۔ الف (نام بدل دیا گیا) جو میرا سینئر بلاک وارڈن تھا، بہت ہی معروف موسیقار اور نغمہ نگار تھا، ایک دن مجھ سے رازدارانہ انداز میں بولا، ''ڈاکٹر، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک آواز مجھے کہہ رہی تھی کہ میں کوئی خواہش کروں یا میں جو جاننا چاہتا ہوں، میری ہر خواہش پوری ہوگی۔ تمہارے خیال میں مجھے کیا مانگنا چاہیے؟ کیا میں یہ معلوم کروں کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی۔ ڈاکٹر، تم جانتے ہو، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کب ہمیں، کب ہمارے کیمپ والوں کو آزادی ملے گی اور ہماری تکالیف ختم ہوں گی۔''

یہ سن کر میں نے اس سے پوچھا، ''تم نے یہ خواب کب دیکھا؟''

''فروری انیس سو پینتالیس میں۔'' اس نے جواب دیا۔ اب مارچ شروع ہو چکا تھا۔

''تمہارے خواب کی آواز نے کیا جواب دیا؟''

اس نے بہت ہی خفیہ انداز سے کہا، ''تیس مارچ۔''

جب میرے دوست الف نے مجھ سے اس خواب کے بارے میں ذکر کیا تو وہ اس بات سے بہت پُر امید اور یقینی تھا کہ اس کے خواب کی آواز درست ہوگی۔ لیکن جوں جوں مذکورہ تاریخ قریب آئی، ہمیں ایسی خبریں ملیں کہ فی الحال اس تاریخ تک ہماری رہائی ممکن نہیں ہے۔ انتیس مارچ کو الف اچانک بیمار پڑ گیا اور اُس کا درجہ حرارت بڑھتا ہی گیا۔ تیس مارچ کو کہ جس کے بارے میں اس کے خواب کی الہامی آواز نے اسے آزادی کا کہا تھا، وہ غنودگی میں چلا گیا اور اپنا ذہن کھو بیٹھا۔ اکتیس مارچ کو وہ مر چکا تھا۔ بہ ظاہر اس کی موت کا سبب ٹائیفائیڈ تھا۔

جو لوگ انسان کی ذہنی کیفیت ... اس کی جرات اور امید یا ان کی کمی... مدافعت

کی کیفیت کے درمیان قریبی ربط سے واقف ہیں، یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ امید اور جرات کے اچانک کھو جانے سے جسم پر مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میرے دوست کی اصل وجہ یہ رہی کہ اسے آزادی کی جو امید تھی، وہ بر نہ آئی اور انتہائی مایوس ہو گیا۔ اس چیز نے ٹائیفائیڈ انفکشن سے مقابلے کی اس کی مدافعانہ مزاحمت کو بہت زیادہ کم زور کر دیا۔ مستقبل پر اُس کا اعتماد اور زندہ رہنے کی آرزو مفلوج ہو گئی اور پھر اس کا جسم بیماری کا شکار ہو گیا... اور یوں، اس کے خواب کی آواز بالآخر درست ثابت ہوئی۔ وہ اس زندگی سے آزاد ہو گیا۔

اس کیس کا مشاہدہ اور نتیجہ بالکل اس حقیقت سے مماثل تھا جس کی جانب حراستی کیمپ کے ڈاکٹر نے میری توجہ دلائی تھی۔ انیس سو چوالیس کے کرسمس اور انیس سو پینتالیس کے نئے سال کے آغاز پر قیدیوں میں شرح اموات کہیں زیادہ تھی۔ اس کی رائے میں، اس اضافے کی وجہ سخت کام میں اضافہ یا غذائی قلت یا موسمی تبدیلی یا وبا کا پھوٹنا نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کیمپ میں جو قیدی دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تھے، انھوں نے امید لگالی تھی کہ اس کرسمس پر وہ اپنے گھر پر ہوں گے۔ جیسے جیسے کرسمس اور نیا سال قریب آ رہا تھا، اور کوئی خوش خبری نہیں مل رہی تھی، اُن کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی قوتِ مدافعت پر خطرناک اثرات مرتب ہو رہے تھے اور بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہو رہے تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، کیمپ میں لوگوں کی اندرونی قوا کی بحالی کی کسی بھی کوشش میں کامیابی کی بنیاد یہ تھی کہ انھیں ان کا مستقبل کا ہدف دکھایا جائے۔ نیچھا کے بہ قول، ''وہ شخص جس کے پاس زندہ رہنے کیلئے 'کیوں' موجود ہے، وہ 'کیسے' تو پا ہی لیتا ہے۔'' یہ قول قیدیوں سمیت تمام نفسی جسمی امراض میں مبتلا افراد کے بارے میں ایک رہ نمایانہ کلید فراہم کرتا ہے۔ جب کبھی ایک آدمی کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں ہے... ہدف... تو اس کے حصول کیلئے وہ سخت سے سخت 'کیسے'... مشکلات... کو بھی جھیلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

مگر ہائے افسوس اس شخص پر جس کی نظر میں اس کی زندگی کا کوئی ہدف، کوئی احساس نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے پاس کوئی منزل بھی نہیں کہ جس کی طرف وہ قدم اٹھائے۔ وہ جلد بھٹک جائے گا اور خود کو کھودے گا۔ جو افراد اپنی تمام تر امید کھو چکے ہوں، ان کا ایک مخصوص جواب یہ ہوتا تھا، ''میرے پاس تو اب زندگی میں توقع کرنے اور حاصل کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا۔'' اس کے جواب میں آدمی بھلا کیا کہہ سکتا ہے؟

دراصل، زندگی کے بارے میں اس رویہ میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت تھی جو وہ رکھتے تھے۔ ہمیں یہ رویہ اپنے تئیں سیکھنے اور پھر مایوس لوگوں کو سکھانے کی ضرورت تھی کہ ''یہ اہم نہیں کہ ہم زندگی سے کیا توقع کرتے ہیں، بلکہ اہم یہ ہے کہ زندگی ہم سے کیا توقع کرتی ہے۔'' ہمیں زندگی کے مفہوم کے بارے میں پوچھنے کی بجائے اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ زندگی ہم سے کیا سوال کر رہی ہے... روزانہ اور ہر لمحے۔ ہمارے جوابات محض کسی گفتگو یا سوچ بچار پر مشتمل نہ ہوں، بلکہ درست عمل اور درست سمت پر مشتمل ہوں۔ زندگی کا سب سے بڑا مفہوم یہ ہے کہ اپنے مسائل کا درست جواب تلاش کرنے کی ذمے داری لی جائے اور ہر فرد اس کے مطابق مسلسل کام کرے۔

یہ کام جو زندگی کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہوں، فرد بہ فرد، لمحہ بہ لمحہ مختلف ہوتے ہیں۔ گویا، زندگی کے مفہوم کی عمومی تعریف کرنا ممکن نہیں ہے۔ زندگی کے مفہوم کے بارے میں کسی کے سوالات کا جواب ''چالو'' نہیں ہوسکتا۔ زندگی کا کوئی مفہوم یا مقصد مبہم اور غیر واضح نہیں ہے، لہٰذا اسے بہت ہی حقیقی اور ٹھوس ہونا چاہیے، جیسے زندگی کے افعال اور اقدامات انتہائی حقیقی اور ٹھوس ہیں۔ یہ آدمی کی منزل کی تشکیل کرتے ہیں اور ہر آدمی کی منزل دوسرے آدمی کی منزل سے مختلف اور منفرد ہوتی ہے۔ یہ انفرادی معاملہ ہے، اجتماعی نہیں ہے۔ ایک آدمی کی منزل کا موازنہ کسی دوسرے آدمی یا اُس کی منزل سے نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی صورتِ حال دوبارہ نہیں آتی۔ اور ہر صورتِ حال مختلف ردِعمل کا تقاضا کرتی

Scanned by CamScanner

ہے۔ بعض اوقات آدمی جس صورتِ حال میں خود کو پاتا ہے، اسے تشکیل دینے کیلئے اسے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ دیگر مواقع پر عملی اقدامات سے زیادہ غور و فکر کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات محض اپنے مقدر کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ وقت گزر جائے۔ ہر صورتِ حال اپنے تئیں منفرد اور یگانہ ہے اور جس وقت جو صورتِ حال ہے، اس کیلئے صرف ایک ہی درست جواب ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کو حل کیا جا سکے۔

جب آدمی کو یہ پتا چل جائے کہ تکالیف سے گزرنا ہی اس کی منزل ہے تو وہ اپنی تکالیف کو ایک کام کے طور پر تسلیم کرے گا۔ اور یہ اس کا واحد اور منفرد کام ہوگا۔ وہ اس بات کو بہ بانگ دہل تسلیم کرے گا کہ اس کی تکالیف پوری کائنات میں سب سے منفرد ہیں اور وہی تنہا اِن میں مبتلا ہے۔ کوئی بھی اس کی تکالیف کو دور نہیں کر سکتا اور نہ اس کی تکالیف کو سہہ سکتا ہے۔ یہ منفرد موقع اسے میسر ہے اور اب اس پر ہے کہ وہ کیسے یہ بوجھ برداشت کرتا ہے۔

ہمارے لیے، قیدی کی حیثیت سے... یہ خیالات ایسی قیاس آرائیاں نہیں تھے کہ جن کی مدد سے ہم خود کو حقیقت سے الگ کر سکیں۔ ان خیالات سے بس ہماری کچھ مدد ہو سکتی تھی۔ یہ ہمیں مایوسی سے دور رکھتے تھے، ایسے شدید حالات میں بھی کہ جب زندہ رہنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ عرصہ پہلے ہم ایسے ہی مرحلے سے گزر رہے تھے کہ جب ایک تحقیقی مطالعے کے دوران ہم سے پوچھا گیا کہ زندگی کا مفہوم کیا ہے۔ تو ہم نے بتایا کہ ہمارے نزدیک، زندگی کا یہ مفہوم ہے کہ زندگی اور موت اور تکالیف کے وسیع جال کو گلے لگا لیا ہے۔

ایک مرتبہ جب ہم پر تکالیف کو مفہوم کھل گیا تو ہم نے کیمپ کے تشدد کو نظر انداز کرنے یا جھوٹی خوش فہمیاں گڑھنے یا مصنوعی پُر امیدی اختیار کرنے کا عمل چھوڑ دیا۔ یوں، ہم کیمپ کے تشدد اور سختیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تکالیف ہمارے روزمرہ کام کا حصہ بن

Scanned by CamScanner

گئی تھیں اور ہم ان سے بچنے یا پیچھا چھڑانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ہم ان میں چھپے کامیابی کے مواقع کو جان چکے تھے۔ وہ مواقع جنھوں نے غالب کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ آساں ہوگئیں''۔

ہمارے سامنے ابھی بہت سی تکالیف تھیں جنھیں سہنا تھا۔ لہٰذا، یہ بہت ضروری تھا کہ ہم تمام تکالیف کا سامنا کریں اور اپنے کم زور لمحات اور دبے ہوئے آنسوؤں کو کم سے کم رکھیں۔ البتہ اپنے آنسوؤں پر کسی شرمندگی کی ضرورت نہیں تھی۔ ان آنسوؤں کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کے اندر بہت جرات ہے، تکالیف سہنے کی جرات۔ بہت کم لوگ یہ ادراک کر پائے۔ بعض لوگ اس پر شرم سار تھے اور اس کا اظہار گاہے گاہے کرتے تھے کہ وہ روئے۔

سائکوتھیراپی یا سائکو ہائجین کا ہلکا پھلکا سلسلہ، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کیمپ میں ممکن تھا۔ انفرادی سائیکوتھیراپی کی کوششوں کا تعلق زندگی بچانے والے عمل سے ہوتا تھا۔ عموماً ان کا مقصد خودکشی سے بچانا تھا۔ کیمپ کا ایک سخت قانون یہ تھا کہ کسی قیدی کو خودکشی سے نہ بچایا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص پھندا لگا کر خودکشی کرتا ہوا پایا جائے تو اسے اس عمل سے روکا نہ جائے۔ لہٰذا، یہ بہت اہم تھا کہ کسی پر ایسا اقدام کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

مجھے خودکشی کے دو کیس یاد ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ہی مشابہت رکھتے تھے۔ دونوں افراد کہتے تھے کہ وہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کے وہی مخصوص خیالات تھے... اب زندگی میں امید کرنے کو رکھا ہی کیا ہے۔ دونوں کیسوں میں، یہ سوال محسوس کرانے کی ضرورت تھی کہ زندگی اب بھی ان سے بہت کچھ توقع رکھتی ہے؛ کچھ ایسا جو مستقبل میں ہوسکتا ہے۔ ہمیں پتا چلا کہ ان میں سے ایک قیدی کا ایک بیٹا جو کسی دوسرے ملک میں رہتا ہے، اور وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا ہے۔ دوسرا شخص ایک سائنس داں تھا اور اس نے اپنی سائنسی تحقیقات پر مبنی کئی کتابیں لکھی تھیں، مگر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔

Scanned by CamScanner

اس نے جو کام کیا تھا، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح، پہلے قیدی کے بیٹے کو اپنے ہی باپ کی ضرورت تھی، اس کا قائم مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ انفرادیت اور انوکھا پن ہر فرد کے لحاظ سے مختلف تھا اور انھیں اپنے وجود کا مفہوم اور مقصد عطا کرتا تھا جس میں انسانی محبت سب سے قوی عامل تھا۔ جب ایک فرد کو لگتا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا تو وہ زندہ رہنے کی ذمے داری قبول کرتا اور اس کیلئے ہر ممکنہ اقدام کرتا۔ جس آدمی کو اپنی ذمے داری کا ادراک ہو جاتا ہے، وہ انسان کی حیثیت سے بے چینی سے اس کا انتظار کرتا ہے یا اگر کام نامکمل رہے تو اس کی وجہ سے کبھی اپنی زندگی سے عاجز نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وجود کے ''کیوں'' سے واقف ہوتا ہے اور کسی بھی ''کیسے'' کیلئے تیار رہتا ہے۔

کیمپ میں اجتماعی سائیکوتھیراپی کے مواقع بہت محدود تھے۔ الفاظ کے مقابلے میں درست مثال کہیں زیادہ موثر ہوتی۔ ایک سینئر بلاک وارڈن جس نے اعلا عہدے داروں کو اپنے حوصلہ افزا برتاؤ کے ذریعے ایک طرف نہیں کیا، ہزاروں مواقع پائے۔ برتاؤ کا فوری اثر ہمیشہ الفاظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ الفاظ بھی کارگر ہوئے کہ جب بیرونی حالات کے باعث ذہنی ادراک پذیری (Receptiveness) بہت شدید ہو گئی۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے جب مخصوص بیرونی حالات میں جھونپڑے کے تمام قیدیوں پر شدید ادراک پذیری کے باعث سائیکوتھیراپی کرنا پڑ گئی۔

یہ بہت ہی برا دن تھا۔ پریڈ کے دوران ایک اعلان کیا گیا کہ اب سے کسی بھی قسم کی غلطی کی سزا فوری پھانسی ہو گی۔ ان جرائم میں پرانے کمبلوں سے پٹیاں پھاڑنا (تاکہ اپنے گھٹنوں کو سہارا دے کر درد کم کیا جا سکے) یا بہت معمولی سے چوری شامل تھے۔ چند روز پہلے ایک قحط زدہ قیدی نے گودام کا تالا توڑ کر کچھ آلو چوری کر لیے تھے۔ چوری پکڑی گئی اور چور کا پتا بھی لگ گیا۔ جب اعلا عہدے داروں کو پتا چلا تو انھوں نے حکم دیا کہ اس آدمی کو چھوڑ

Scanned by CamScanner

دیا جائے اور پھر پورا کیمپ ایک دن کیلئے فاقہ کرے جس کی وجہ سے تقریباً ڈھائی ہزار افراد کو ایک دن کا فاقہ کرنا تھا۔

اس دن شام کو ہم جھونپڑے کے فرش پر بہت ہی اداس موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت کم بات کر رہے تھے اور ہر لفظ سے جھنجھلاہٹ عیاں تھی۔ معاملہ مزید خراب اس وقت ہوا کہ جب بجلی بھی چلی گئی۔ اس وقت ہم بالکل ہی بے سدھ ہو چکے تھے۔ لیکن ہمارا سینئر وارڈن ذہین آدمی تھا۔ اس نے فوراً ہمارے ذہنوں میں اس لمحے جو کچھ چل رہا تھا، اس کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی۔ اس نے بتایا کہ اس کے کئی ساتھی گزشتہ چند روز میں بیماری یا خودکشی کی وجہ سے مر چکے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے اُن کی موت کا اصلی سبب بھی بیان کیا: امید چھوڑ دینا۔ اس نے کہا کہ اس شدید کیفیت تک پہنچنے سے بچنے کیلئے مستقبل کی کوئی نہ کوئی امید برقرار رہنا ضروری ہے۔ وہ دراصل، مجھے یہ مشورہ دے رہا تھا۔

خدا جانتا ہے کہ میں نفسیاتی وضاحتیں پیش کرنے یا خطبہ دینے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا... یہ چیزیں میرے ساتھیوں کیلئے ایک طرح کے روحانی معالجے کا کام کرتی تھیں۔ میں ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی، ساتھ ہی تھکن اور چڑچڑاپن بھی طاری تھے۔ لیکن مجھے کوشش کر کے اس منفرد موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ جرات... پہلے سے کہیں زیادہ ضروری تھی۔

چنانچہ میں نے سب سے پہلے آرام کے معمولات بیان کرنا شروع کیے۔ میں نے کہا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران یورپ کی شدید سردیوں میں ہماری حالت اتنی مشکل نہیں تھی کہ ہمارے لیے اس کا تصور بھی محال ہو۔ میں نے کہا، ہم میں سے ہر ایک کو اپنے تئیں یہ پوچھنا چاہیے کہ اسے اس دوران کیا کیا ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کیلئے ایسا نقصان بہت ہی کم ہوگا۔ ہم میں سے جو اَب تک زندہ ہیں، اُن کیلئے جینے کی امید کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ صحت، خاندان، خوشی، پیشہ ورانہ مہارتیں،

Scanned by CamScanner

خوش قسمتی، معاشرے میں مقام... یہ تمام چیزیں ہم دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر کو، ہماری ہڈیاں سلامت ہیں۔ ہم سے جو کچھ چھن چکا ہے، وہ مستقبل میں دوبارہ ہمیں مل سکتا ہے۔ اور پھر میں نے نیچھا کا قول دہرایا: ''جو شے مجھے مارتی نہیں، مجھے مضبوط کرتی ہے۔''

پھر میں نے مستقبل کے بارے میں بات کی۔ میں نے کہا کہ جزوی طور پر، ہمارا مستقبل ہمیں ناامید دکھائی دیتا ہے۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ ہم میں سے ہر فرد اپنے بارے میں یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی بقا کے امکانات نہایت مسدود ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اگرچہ ہم میں ٹائیفائیڈ کی کوئی علامت نہیں ہے، پھر بھی میرے اپنے بچنے کا امکان تقریباً ایک بٹا بیس (بیسواں حصہ) ہے۔ لیکن میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ اس کے باوجود میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ میں اپنی امید کھو دوں اور ہمت ہار بیٹھوں۔ کوئی آدمی یہ نہیں جانتا کہ مستقبل کیسا ہوگا... حتیٰ کہ اگلے گھنٹے کے بارے میں بھی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اگلے چند روز میں کسی اچانک فوجی کارروائی کا کوئی امکان نہیں، لیکن کیمپ کے روزانہ کے تجربات کی روشنی میں ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس کتنے ہی عظیم مواقع موجود ہیں، خاص کر انفرادی سطح پر۔ مثال کے طور پر، کسی کو اُس کے غیر معمولی کام کی وجہ سے خاص گروہ میں شامل کر دیا جائے اور یہ چیز اس کیلئے بالکل ہی غیر متوقع ہوگی۔ اور ہم کہیں گے کہ واہ، اس قیدی کی تو قسمت ہی کھل گئی۔

میں مستقبل اور اس پر پڑے پردے کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ میں تو ماضی کی بات بھی کر چکا ہوں کہ موجودہ تاریکی کے باوجود ہم نے وہاں کتنا مزہ کیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ایک طاق مبلغ کی طرح ایک اور قول بیان کیا۔ کسی نے کیا خوب لکھا ہے کہ ''جو کچھ تم تجربہ کر چکے ہو، دنیا کی کوئی طاقت اسے تم سے نہیں چھین سکتی۔'' نہ صرف ہمارے تجربات، بلکہ وہ سب افعال جو ہم نے کیے، وہ تمام عظیم خیالات جو ہم نے سوچے، اور وہ تمام تکالیف جو ہم نے جھیلیں، یہ سب کہیں نہیں کھوئیں گے۔ یہ اگرچہ ماضی کا حصہ ہیں، لیکن ہماری

Scanned by CamScanner

ملکیت ہیں۔

پھر میں نے کئی مواقع کے بارے میں بات کی جو زندگی کو مفہوم اور مقصد عطا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ زندگی میں کیسے ہی حالات پیش آئیں، ان میں سے مفہوم کبھی ختم نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ہر موقع میں ایک حتمی مفہوم ضرور موجود رہتا ہے، اور وہ مفہوم تکالیف اور مرنے کا ہے، تنگی اور موت کا ہے۔ میں اپنے غریب وطن قیدی ساتھیوں سے مخاطب تھا جو جھونپڑے کی تاریکی میں پوری تن دہی اور خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔ البتہ کبھی کبھی آہ کی آواز آجایا کرتی تھی۔ میں نے بات جاری رکھی کہ انھیں اپنی امید نہیں چھوڑنی چاہیے، بلکہ نا اُمیدی کے شدید حالات میں بھی اپنی جرات برقرار رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ کوشش میں ناکامی سے اس کوشش کی عظمت اور مفہوم کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ ہم میں سے بعض پیچھے کی طرف... اپنے دوست، اپنی بیوی، اپنے زندہ یا مُردہ پیارے، یا خدا کی طرف دیکھتے ہیں... اور وہ ہم سے کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ ہم اسے مایوس کریں۔ وہ امید رکھیں گے کہ ہم انھیں ان تکالیف میں وہ طریقہ بتائیں کہ وہ پورے فخر کے ساتھ کیسے مر سکتے ہیں۔

آخر میں، میں نے اپنی قربانیوں کا ذکر کیا جن میں ہر لحظہ ایک مفہوم تھا۔ ان قربانیوں کی فطرت کے اعتبار سے یہ دنیا اتنی بے وقعت ہے کہ یہاں ان کی پذیرائی کی جا سکے، کیوں کہ یہ دنیا مادی کامیابیوں کی دنیا ہے۔ لیکن، حقیقت یہ ہے کہ ہماری قربانیوں کا مفہوم ہے۔ مجھے بلا تکلف کہنے دیجیے کہ ہمارے دوستوں میں سے جو لوگ کسی نہ کسی مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں، وہ میری بات بغیر مشکل سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہمارے کیمپ میں ایک ساتھی آیا جس نے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ اس کی تکالیف اور موت انسانیت کو بچائیں گی۔ لہٰذا اس نے تکلیف دہ اختتام کو سر آنکھوں پہ لیا۔ اس شخص کیلئے اس کی تکالیف اور موت بہت ہی بامعنی تھیں۔ اس کی قربانی انتہائی اہم تھی۔ وہ بلا کسی وجہ سے مرنا نہیں چاہتا

Scanned by CamScanner

تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا۔

میری گفتگو کا مقصد ہماری زندگی کا بھرپور مفہوم تلاش کرنا تھا... یہاں اور وہاں... اس جھونپڑے میں جہاں عملی طور پر کوئی صورتِ حال ایسی نہ تھی کہ کوئی امید رکھی جا سکے۔ میں نے دیکھا کہ میری کوششیں بار آور ہوئیں۔ جب بجلی کا بلب دوبارہ روشن ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے مایوس دوستوں کے چہرے اب مطمئن تھے اور وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ لیکن، میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرے اندر یہ جرات نہیں تھی کہ اپنے ساتھیوں کی تکالیف میں اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکوں۔ میں نے ایسے کئی مواقع ضائع کر دیے۔

اب ہم قیدیوں کے ذہنی ردِعمل کے تیسرے مرحلے پر آتے ہیں: آزادی کے بعد قیدیوں کی نفسیات۔ لیکن اس سے پہلے ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جو ماہرین نفسیات کثرت سے پوچھا کرتے تھے، خاص کر جب ان معاملات کی ذاتی معلومات بھی ہوتی تھیں تو ان کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ سوال یہ تھا: کیمپ کے محافظوں کے نفسیاتی بہروپ (سائکولوجیکل میک اپ) کے بارے میں آپ کیا بتا سکتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ گوشت پوست رکھنے والے انسان دوسروں قیدیوں سے اس خبیث انداز سے برتاؤ کریں کہ جیسے انھوں نے کیا؟ ایک مرتبہ اس بارے میں سنا تھا اور ہمیں یقین تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی یہ پوچھنے پر مجبور ہو جائے کہ نفسیاتی طور پر کیا یہ ہو سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب کی تفصیل میں جانے سے پہلے چند نکات بیان کرنا ضروری ہیں:

اول، محافظوں میں سے بعض بہت ہی غمگین تھے، غمگین خالصۃً کلینکی حوالے سے۔

دوم، یہ غمگین لوگ اس وقت ہمیشہ منتخب کیے جاتے تھے کہ جب محافظوں کو واقعی سنجیدہ علاحدگی کی ضرورت پڑتی تھی۔

جب ہمیں کام کی جگہ پر گرمائش لینے کی اجازت ہوتی تو ہمیں بہت مزہ آتا تھا۔ دو

Scanned by CamScanner

گھنٹے کی سخت محنت کے بعد یہ مرحلہ آتا تھا جہاں ہم لکڑی کے الاؤ کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ البتہ ایسے محافظ بھی تھے جو صرف ہمیں آرام کرتا دیکھتے تو انھیں لطف ملتا تھا۔ ان کے چہروں سے لطف عیاں ہوتا، خاص کر جب وہ ہمیں یہاں سے اٹھاتے اور حسین آگ کو ٹھنڈی برف سے بجھانے کو کہتے تو اُن کا افسوس بھی نمایاں ہوتا۔ جب شوداستافل کسی فرد کو ناپسند قرار دیتے تو اس بدنصیب قیدی کو چند خاص لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا جو تشدد کے ماہر مانے جاتے تھے۔

سوم، محافظوں کی اکثریت برسوں شدید تشدد دیکھنے کی وجہ سے بے حس ہو جاتی تھی۔ اَخلاقی اور ذہنی طور پر سخت لوگ کم از کم اس غم گینی کی پیمائش کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ لیکن وہ دوسروں کو اس سے بچانے کیلئے بھی کچھ نہیں کرتے تھے۔

چہارم، یہ بتانا ضروری ہے کہ بعض محافظ بھی ہم پر ترس کھاتے تھے۔ میں یہاں صرف کیمپ کے کمانڈر کا ذکر کروں گا جس سے مجھے رہائی ملی۔ آزادی کے بعد پتا چلا کہ صرف کیمپ کا ڈاکٹر جو خود قیدی تھا، اسے پہلے سے جانتا تھا... کہ اس نے قیدیوں کو درکار دوا کی خریداری کیلئے قریبی مارکیٹ سے رتی برابر رقم بھی اپنی جیب سے خرچ نہیں کی... مگر اس نے ہم پر کبھی ہاتھ تک نہ اٹھایا تھا۔ جبکہ کیمپ کا سینئر وارڈن جو خود بھی قیدی تھا، شوداستافل گارڈز سے بھی زیادہ سخت تھا اور قیدیوں کو سزا دینے کا چھوٹا سا موقع بھی جانے نہیں دیتا تھا۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ کسی فرد کے بارے میں معمولی سی معلومات کہ یہ کیمپ کا محافظ ہے یا قیدی، اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ انسانی ہمدردی ہر گروہ میں پائی جا سکتی تھی۔ مختلف گروہوں کے درمیان حدود متجاوز تھیں اور یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا کہ کسی گروہ کو ہم فرشتہ یا شیطان قرار دے سکیں۔ کیمپ کے تمام تر اثرات کے باوجود ایک محافظ یا فورمین کیلئے یہ بہت اہم تھا کہ وہ قیدیوں سے رحم دلی رکھے۔ دوسری جانب قیدیوں کی کمینگی بھی عروج پر تھی کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں کی بری طرح تحقیر و تذلیل کرتے۔ جن لوگوں میں

Scanned by CamScanner

ایسا برتاؤ پایا جاتا تھا، وہ قیدیوں کیلئے بہت ہی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ایک فورمین نے خاموشی سے روٹی کا ایک ٹکڑا مجھے دے دیا جو اُس نے ناشتے کے راشن سے بچایا تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا روٹی کا ٹکڑا بھی بہت غنیمت تھا۔

اس تمام صورتِ حال سے ہم یہ سیکھ سکتے ہیں کہ اس دنیا میں انسانوں کی دو نسلیں ہیں... شائستہ انسانوں کی نسل اور ناشائستہ انسانوں کی نسل۔ یہ دونوں نسلیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ہر معاشرے میں یہ دونوں گروہ موجود ہیں۔ کوئی گروہ مکمل طور پر شائستہ یا ناشائستہ افراد پر مشتمل نہیں ہوتا۔ اس تناظر میں، کوئی بھی گروہ، ''خالص نسل'' نہیں لہٰذا کیمپ کے محافظوں میں بھی شائستہ لوگ قدرے پائے جاتے تھے۔

حراستی کیمپ کی زندگی نے انسانی روح کو کھول کر رکھ دیا اور اسے گہرائی سے آشکار کر دیا۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں کہ اس گہرائی میں بھی دوبارہ انسان کی خصوصیات ہی تھیں جو فطرتاً اچھے اور برے کا مجموعہ تھیں؟ وہ شگاف جو اچھے اور برے کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے اور گہرائی میں بڑھتا جاتا ہے، جو حراستی کیمپ میں بہت واضح تھا۔

یہاں سے حراستی کیمپ کی نفسیات والے باب تک قیدیوں کی نفسیات بتائی جائے گی۔ آزادی کے تجربات بیان کرتے ہوئے جو فطرتاً انفرادی ہی ہونے چاہئیں، ہم مختلف واقعات بیان کریں گے جو شدید تناؤ والے ایام کے بعد کیمپ کے گیٹوں کے اوپر لگائے گئے سفید جھنڈے والے ایام کے درمیان پیش آئے۔ اس اندرونی تجسس کا خاتمہ مکمل سکون پر ہوا۔ لیکن یہ سوچنا بالکل غلط ہوگا کہ ہم خوشی سے پاگل ہو گئے۔ تو پھر، کیا ہوا؟

ہم قیدی تھکے قدموں سے کیمپ کے گیٹوں کی طرف خود کو گھسیٹتے رہے۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے اردگرد دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ پھر ہم نے چند مزید قدم کیمپ کے باہر رکھے۔ اس بار ہم پر کوئی حکم جاری نہیں کیا گیا، نہ ہمیں کوں

Scanned by CamScanner

اور لاتوں سے بچنے کیلئے فوری طور پر بچاؤ کی ضرورت پڑی۔ اوہ، اس مرتبہ تو محافظ نے ہمیں سگرٹ پیش کی۔ ہم پہلی نظر میں بہ مشکل انھیں پہچان پائے۔ وہ بہت تیزی سے شہری لباس بدل چکے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ سڑک کے ساتھ چلتے رہے۔ جلد ہی ہماری ٹانگیں ٹکرائیں اور چوٹ لگنے کا خطرہ ہوا۔ لیکن ہم پہلی مرتبہ ایک آزاد فرد کی حیثیت سے کیمپ کے اطراف کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ''آزادی'' ہم نے دوبارہ یہ الفاظ دہرائے، اگرچہ ہم اسے ابھی جذب نہ کر پائے تھے۔ گزشتہ برسوں میں ہم نے یہ لفظ اتنی مرتبہ ادا کیا تھا کہ یہ اپنا معنی ہی کھو بیٹھا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے شعور میں داخل نہ ہو سکا؛ ہم یہ بات ہضم ہی نہ کر پائے کہ ہم آزاد ہیں۔

ہم باغ تک آئے جو پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے انھیں دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ وہاں ہیں لیکن ہمارے اندر اِن کے بارے میں کوئی احساس نہیں تھا۔ ہمارے اندر خوشی کا ایک جھماکا اُس وقت پیدا ہوا جب ہم نے ایک مرغا دیکھا جس کے پَر رنگ برنگے تھے۔ لیکن یہ جھماکا صرف جھماکا ہی تھا، کیوں کہ ہم ابھی تک خود کو اس دنیا سے مربوط نہیں کر پائے تھے۔

شام کو جب ہم سب دوبارہ جھونپڑے میں ملے تو ایک فرد نے دوسرے فرد سے رازدارانہ انداز میں کہا، ''مجھے بتاؤ، تم آج کس شے سے خوش ہوئے؟''

اور دوسرے آدمی نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ جواب دیا کہ گویا وہ نہیں جانتا؛ اور ہم سب نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم خوشی محسوس کرنے کی اہلیت کھو چکے تھے جو، اَب ہمیں رفتہ رفتہ دوبارہ سیکھنا تھی۔

نفسیاتی طور پر، آزاد قیدیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے depersonalization کہا جا سکتا ہے۔ ہر شے غیر حقیقی لگ رہی تھی۔ گویا، یہ سب کچھ خواب ہے۔ ہم یہ یقین ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ سب سچ ہے۔ جبکہ اتنے عرصے تک

Scanned by CamScanner

ہمارے خواب ہمیں دھوکا دیتے رہے۔ ہم یہ خواب دیکھتے رہے کہ آزادی کا دن آ گیا ہے، ہم آزاد ہو گئے ہیں، گھر پہنچ چکے ہیں، اپنے دوستوں کو مبارک باد دے رہے ہیں، اپنی بیویوں سے گلے مل رہے ہیں، اور ایک میز کے گرد بیٹھ کر سب کو بتا رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کچھ بیتی... حتیٰ کہ ہم اپنے خوابوں میں کیسے اکثر اپنی آزادی کو دیکھتے رہے۔ اور پھر، اچانک ہمارے کانوں میں ایک سیٹی کی آواز آتی جو جاگنے کی علامت تھی۔ اور ہماری آزادی کے خواب چکنا چور ہو جاتے۔

اور اب یہ خواب حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن کیا واقعی ہم اس پر یقین کر سکتے تھے؟

ذہن کے مقابلے میں جسم میں رکاوٹیں کم تھیں۔ جب اسے آزادی ملی تو اس نے پہلے ہی لمحے اس نئی آزادی کا اچھا استعمال کیا۔ یہ حریصوں کی طرح کئی گھنٹے اور کئی دن اور رات کھاتا رہا۔ یہ بہت حیران کن تھا کہ ایک آدمی کتنی مقدار کھا سکتا ہے۔ جب ایک قیدی کو اس کے کسان دوست نے بلایا تو وہ کھاتا رہا، مزید کھاتا رہا اور پھر اوپر سے کوفی بھی پی جس کی وجہ سے اس کی زبان کھل گئی اور پھر وہ گھنٹوں بولتا رہا۔ اس کے دماغ پر برسوں سے جو دباؤ تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی گفتگو سنتے ہوئے ایک تاثر تو یہ ملا کہ اسے بولنا تھا... اس کی بولنے کی خواہش اس کے قابو سے باہر تھی۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن پر مختصر دورانیہ کیلئے انتہائی دباؤ رہا (مثلاً گستاپو کے سوالاتِ جرح کے دوران) تو ایسا ہی ردِ عمل آیا۔ کئی دن گزرنے کے بعد بھی صرف ایک زبان کھلی، لیکن پھر اچانک ایک عجیب احساس سے اجنبی بیڑیاں ٹوٹ گئیں جنھوں نے انھیں جکڑ رکھا تھا۔

ایک دن، آزادی کے چند روز بعد، میں ایک مرغزار میں ٹہل رہا تھا اور میرا رُخ کیمپ کے قریب واقع مارکیٹ ٹاؤن کی طرف تھا۔ اچانک آسمان پر مجھے قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ میں کسی کو کھلکھلاتے ہوئے سن سکتا تھا۔ وہاں میلوں دور تک کوئی بھی نہیں تھا... کچھ بھی نہیں... بس، زمین تھی اور آسمان اور قہقہے اور کھلی آزادی۔ میں ٹھہرا، اردگرد نظر دوڑائی اور

Scanned by CamScanner

پھر آسمان کی طرف دیکھا... پھر اپنے گھٹنوں کی طرف نیچے دیکھا۔ اس لمحے میں اپنے بارے میں یا دنیا کے بارے میں بہت کم جان پایا... میرے ذہن میں صرف ایک جملہ دوڑ رہا تھا... ایک ہی جملہ: خدا سے میں نے تنگ قید سے پناہ مانگی اور اُس نے کھلی آزادی عطا کر دی۔

میں نہ جانے کتنی ہی دیر اپنے گھٹنوں کے بل پڑا رہا اور اس جملے کو دہراتا رہا کہ وہ میرے ذہن کی یادداشت ہی سے محو ہوگئی۔ لیکن، میں اتنا جانتا ہوں کہ اس دن، اس ساعت، میری نئی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ قدم بہ قدم میں آگے بڑھ رہا تھا، یہاں تک کہ میں ایک عام انسان بن گیا۔

کیمپ کے شدید ایام جو شدید ذہنی تناؤ کا باعث تھے، سے لے کر خلاصی تک کا سفر (اعصابی جنگ سے ذہنی سکون تک) یقیناً رکاوٹوں سے خالی نہیں تھا۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ آزاد قیدی کو کسی قسم کی روحانی نگہ داشت کی مزید ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جو آدمی اتنا طویل عرصہ کسی انتہائی ذہنی دباؤ میں رہا ہو، وہ فطری آزادی کے بعد بھی خطرے میں ہوتا ہے، خاص کر جب یہ دباؤ اچانک ختم ہو جائے تو یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ خطرہ (نفسیاتی حفظ صحت کے تناظر میں) اس نفسیاتی تبدیلی کا لازمہ ہے۔ جیسا کہ کیسن ورکر جب ڈائیور چیمبر (جہاں ماحولیاتی دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے) سے اچانک باہر آجائے تو اسے شدید جسمانی خطرات لاحق ہو جاتے ہیں، ایسے ہی جو آدمی انتہائی نفسیاتی دباؤ سے باہر نکل آئے تو اس کی اَخلاقی اور روحانی صحت متاثر ہو جاتی ہے۔

اس نفسیاتی مرحلے کے دوران ایک مشاہدہ یہ تھا کہ زیادہ ناپختہ مزاج رکھنے والے افراد اس تشدد کے اثرات سے بچ نہیں سکتے تھے کہ جو وہ اپنے اردگرد کیمپ میں دیکھتے تھے۔ اب، آزاد ہونے کے بعد وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی آزادی کا استعمال غلط اور ظالمانہ طریقے سے کرنے لگیں گے۔ چنانچہ اُن کی زندگی میں صرف ایک شے بدلتی تھی کہ پہلے اُن پر ظلم ہوتا تھا اور اب وہ ظالم تھے۔ وہ اپنے برتاؤ کیلئے صرف ایک دلیل دیا کرتے تھے کہ ہم پر بھی تو ظلم

Scanned by CamScanner

ہوا ہے۔ ایسا اکثر غیر نمایاں واقعات میں دیکھنے میں آتا تھا۔

میں اور میرا ایک دوست ٹہل رہے تھے کہ اچانک ہم ایک سبز لہلاتے کھیت تک پہنچے۔ میں وہاں جانے سے ہچکچایا، لیکن اس نے میرا ہاتھ کھینچا اور کھیتوں میں گھس گیا۔ میں نے بڑبڑانے کی کوشش کی کہ ہمیں ان لہلاتے کھیتوں میں گھسنا مناسب نہیں ہے۔ وہ مجھ پر غصہ ہوا اور چلایا، ''یہ بات نہ کرو! ہمارے ساتھ کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔ میری بیوی اور بچے کو گیس میں پھینک دیا گیا... اس سے زیادہ اور کیا کہوں... اور تم مجھے فصلیں خراب کرنے سے منع کر رہے ہو!''

ایسے افراد کو یہ سمجھانے میں بہت وقت لگ جاتا تھا کہ اُن کے ساتھ کیسا ہی برا کیوں ناں کیا گیا ہو، انھیں تب بھی غلط کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم انھیں یہ باور کرانے کی بے حد کوشش کرتے کہ محض چند فصلیں اجاڑ دینے سے نقصان کہیں زیادہ ہوگا۔ مجھے وہ قیدی اب بھی یاد ہے جس نے اپنی آستینیں چڑھا کر اپنا سیدھا ہاتھ میری ناک کے نیچے رکھا اور چلاتے ہوئے بولا، ''اگر میں اس ہاتھ سے خون نہ کرتا تو میرا ہاتھ کب کا کاٹا جا چکا ہوتا۔'' یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جس شخص نے یہ الفاظ کہے، وہ برا آدمی نہیں تھا۔ وہ کیمپ کے بہترین ساتھیوں میں سے تھا۔

ذہنی دباؤ سے فوری چھٹکارے کی وجہ سے جو اَخلاقی زوال آتا، اس سے قطع نظر آزاد قیدیوں کے کردار میں جو زوال آتا، وہ بہت ہی خطرناک ہوتا۔ وہ جب اپنی پرانی زندگی کی طرف واپس جاتے ان میں تلخی اور مایوسی بلا کی ہوتی۔

جب وہ اپنے آبائی علاقے واپس آتے تو اُن میں اس تلخی کے کئی اسباب ہوتے۔ مثال کے طور پر، جب ان سے کئی جگہوں پر بہت ہی روکھے پھیکے انداز سے ملا جاتا تو ان کے مزاج میں تلخی آجاتی۔ اکثر انھیں یہ سننے کو ملتا کہ ہمیں تو اس بارے میں کچھ نہیں پتا، یا ہم نے بھی کئی تکالیف سہی ہیں... تو یہ لوگ چڑچڑے یا بدمزاج ہو جاتے۔ وہ اپنے تئیں پوچھتے

کہ کیا ملنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے؟

مایوسی کا تجربہ فرداً فرداً مختلف ہوتا۔ قسمت بہت ہی ظالم لگتی۔ ایک آدمی جو برسوں یہ سوچتا رہا ہو کہ وہ تمام ہی تکالیف جھیل چکا ہے، اس مرحلے پر یہ سمجھنے لگتا کہ تکالیف کی کوئی حد نہیں ہے اور اسے ابھی مزید تکالیف برداشت کرنی ہیں۔

جب ہم کیمپ میں ہوتے اور کسی کو حوصلہ دینے کی کوشش کرتے تو اسے کہتے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچے اور یاد کرے کہ وہ واپس جائے گا تو بہت سی خوشیاں اس کی منتظر ہیں۔ لیکن، آزادی کے بعد؟ جب یہ مرد واپس اپنے گھروں کو آتے تو اُن کا انتظار کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ افسوس اُس شخص پر جو کیمپ میں رہتے ہوئے یہ سوچتا تھا کہ کوئی اس کا منتظر ہے، اور اس آس میں وہ زندہ رہا، یہاں آکر پتا چلتا کہ ایسا کچھ بھی نہیں۔ افسوس اس شخص پر جس کے خوابوں کی تعبیر کا وقت آیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ سب تو بہت مختلف ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک سواری پر سوار ہوا، اپنے اس گھر کی طرف سفر شروع کیا جس کا تصور وہ برسوں کرتا رہا... پھر دروازے پر لگی گھنٹی بجائی، جیسا کہ وہ برسوں اپنے خوابوں میں دیکھتا رہا، لیکن جب حقیقتاً گھر کا دروازہ کھلا تو جسے دروازہ کھولنا چاہیے تھا، اس نے تو دروازہ کھولا نہیں، اور نہ کبھی کھولے گا۔

ہم کیمپ میں تھے تو اکثر آپس میں کہا کرتے تھے کہ ہم نے یہاں جو تکالیف جھیلی ہیں، ان کی تلافی دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی خوشی نہیں کر سکتی۔ ہمیں خوشی کی امید نہیں تھی... اور خوشی کی امید ہماری تکالیف، ہماری قربانیوں اور ہماری موت کے مقابلے میں کوئی جرات پیدا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ ہم خوشی کیلئے تیار بھی نہیں تھے۔ یہ مایوسی کی وہ کیفیت تھی جو اکثر قیدی تجربہ کر رہے تھے اور ان کیلئے اس سے نکلنا انتہائی مشکل تھا۔ کسی سائیکاٹرسٹ کیلئے یہ بھی بہت ہی مشکل تھا کہ وہ ان کی اس ضمن میں مدد کر سکے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے کہ یہ حالات انھیں پست حوصلہ کر رہے تھے۔ اس کے

Scanned by CamScanner

برخلاف، انھیں تحریک بھی ملتی تھی۔

تاہم، ہر قیدی آزاد ہونے کے بعد جب اپنی قید کے تجربات کو یاد کرتا تو وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا کہ وہ بھلا کیوں کر قید کی سختیوں کو سہ گیا۔ جب آزادی کا دن آیا تو ایک جانب سب کچھ بہت حسین خواب لگ رہا تھا تو دوسری جانب قید کے بیتے دن بھیانک خواب محسوس ہو رہے تھے۔

گھر آنے کا تجربہ ان تمام تجربات میں سب سے اہم اور دل نشیں تجربہ تھا اور نہایت دل کش احساس بھی کہ بہ ہر حال، وہ تکالیف گزر گئیں، اور اب یہاں سوائے خدا کے خوف کے، کوئی خوف نہیں۔

Scanned by CamScanner

2

لوگوتھیراپی

میری یہ مختصر سی آپ بیتی پڑھنے کے بعد قارئین عموماً میرے زیادہ اور بھرپور علاجی فلسفے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں نے یہاں اس بارے میں تفصیلی اور واضح تحریر پیش کردی ہے۔

یہ کام آسان نہیں تھا۔ ایک ایسا مواد جس کیلئے جرمن زبان میں بیس سے زیادہ جلدوں کی ضرورت ہو، اسے اپنے قارئین کیلئے کوزے میں بند کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے کہ جب ایک امریکی ڈاکٹر میرے دفتر میں آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا، ''ڈاکٹر، کیا آپ سائیکوانالسٹ ہیں؟'' میں نے اسے جواب میں کہا، ''سائیکوانالسٹ تو نہیں، البتہ سائیکوتھیراپسٹ کہہ سکتے ہیں۔''

اس نے سوال کرنا جاری رکھا، ''آپ نفسیات میں کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟''

میں نے جواباً کہا، ''میرا اپنا نظریہ ہے جسے میں ''لوگوتھیراپی'' کہتا ہوں۔''

''کیا آپ مجھے ایک جملے میں مجھے بتا سکتے ہیں کہ لوگوتھیراپی (Logotherapy) کیا ہے؟'' وہ مزید گویا ہوا، ''یا کم از کم لوگوتھیراپی اور سائیکوانالسس میں کیا فرق ہے؟''

''جی میں بتاتا ہوں،'' میں نے جواب دیا، ''لیکن کیا آپ مجھے ایک جملے میں مختصراً یہ بتا سکتے ہیں کہ سائیکوانالسس کیا ہے؟''

اس کا جواب یہ تھا کہ سائیکوانالسس کے دوران مریض کو ایک بستر پر لٹا دیا جائے

Scanned by CamScanner

اور وہ سب بتا دے جو وہ بتانے سے گریز کرتا ہے۔

یہ بات سن کر میں نے فوری طور پر اسے کہا کہ ''لوگوتھیراپی میں مریض کو سیدھا بٹھایا جاتا ہے اور وہ سب کچھ سنتا ہے، جو بعض اوقات سننا نہیں چاہتا۔

بہ ہر کیف، یہ تعریف تو بہت ہی مختصر اور مہمل ہے۔ سائیکوانالیسس کے مقابلے میں، لوگوتھیراپی کچھ ماضی میں جھانکنے اور کچھ اپنے اندر جھانکنے کا طریقہ ہے۔ لوگوتھیراپی زیادہ تر مستقبل پر فوکس کرتی ہے، اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ مریض کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل میں اپنے لیے کوئی پوشیدہ معنی تلاش کرے۔ (اس تناظر میں، لوگوتھیراپی بلاشبہ مفہوم رخی سائیکوتھیراپی ہے۔) اسی کے ساتھ، لوگوتھیراپی ایسے تمام واہموں اور خبیث خیالات پر سے توجہ ہٹاتی ہے جو اعصابی خلل (نیوروسس) کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ یوں، اس کے مریض کی مخصوص خود رُخی کیفیت جاری رہنے اور مزید بڑھنے کی بجائے ختم جاتی ہے۔

یقیناً اس قسم کا بیانیہ کہیں زیادہ سادہ ہے؛ لوگوتھیراپی میں مریض کا مقابلہ اس کے مفہوم حیات سے ہوتا ہے اور وہ اسے نیا رخ دیتا ہے۔ اور جب وہ مفہوم حیات سے واقف ہوتا ہے تو دراصل وہ اپنے اعصابی خلل پر کہیں زیادہ قابو کرنے کے قابل ہو پاتا ہے۔

آیئے، میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے اس کا نام ''لوگوتھیراپی'' کیوں رکھا ہے۔ لفظ ''لوگو'' ایک یونانی لفظ ہے جس کا معنی ہے، ''مفہوم''... اور اس کا فوکس آدمی کے وجود کے مفہوم اور مقصد کی تلاش ہے۔ لوگوتھیراپی کے مطابق، یہ طریقہ کار کسی انسان کی زندگی کے اندر اس کی بنیادی تحریک (موٹیویشن) کی تلاش کی جدوجہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مفہوم کی خواہش کو خوشی کے بنیادی تناظر میں بیان کرتا ہوں (یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مفہوم کی خواہش نہیں، بلکہ خوشی کی خواہش ہے) جس کے گرد فرائیڈین سائیکولوجی گھومتی ہے۔ اسی طرح، طاقت کی خواہش جس کے گرد ایڈلیرین سائیکولوجی گھومتی ہے اور striving for

Scanned by CamScanner

superiority کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

مفہوم کی خواہش

مفہوم کی تلاش آدمی کی زندگی کی بنیادی تحریک ہے، نہ کہ ثانوی مجبوری۔ ہر فرد کی زندگی میں یہ مفہوم اتنا منفرد اور یکتا ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہی اسے کھوج سکتا ہے۔ تبھی اس کی مفہوم کی خواہش کو قرار مل سکتا ہے۔ بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ مفہوم اور اقدار محض دفاعی میکانزم، ردِعمل اور تبدیلی کی تشکیل ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن، میرے نزدیک، میں محض اپنے دفاعی میکانزم کی خاطر زندہ رہنا نہیں چاہوں گا اور نہ صرف ردِعمل کی تشکیل کیلئے مرنے کیلئے تیار ہوں گا۔ انسان تو اپنے آئیڈیل اور اقدار کی خاطر ہی زندہ رہنے حتیٰ کہ مرنے کو بھی ترجیح دیتا ہے۔

فرانس میں چند برس پہلے ایک عوامی رائے شماری کی گئی جس کے نتائج سے پتا چلا کہ نواسی فیصد افراد نے یہ تسلیم کیا کہ انھیں کسی ایسی شے کی ضرورت ہے جس کی خاطر وہ زندہ رہ سکیں۔ تاہم، اکسٹھ فیصد نے یہ بھی مانا کہ ان کے اندر ہی کچھ ایسا ہے یا کوئی ہے جس کیلئے وہ کٹ مرنے کو بھی تیار ہوں گے۔

ایک اور جائزہ اڑتالیس کالجوں کے سات ہزار نو اڑتالیس طلبہ کا لیا گیا۔ یہ دو سالہ مطالعہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ کے تعاون سے جانز ہاپکنز یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ اُن کیلئے زندگی میں سب سے اہم کیا ہے تو سولہ فیصد نے جواب دیا، ''بہت زیادہ پیسہ کمانا'' جبکہ اٹھتر فیصد طلبہ کا پہلا ہدف تھا، ''اپنی زندگی میں مقصد اور مفہوم تلاش کرنا۔''

یقیناً، کچھ کیسوں میں فرد کی دلچسپی اس کی اقدار کے اعتبار سے اس کے اندرونی مخفی کیفیات سے خلط ملط ہوگئی ہوگی، لیکن اگر ایسا ہے بھی تو یہ اس اصول سے استثنا ہوگا، نہ کہ

Scanned by CamScanner

خود اصول ہی کو غلط قرار دے دیا جائے۔ ایسی صورت میں، ہمیں جھوٹی اقدار کا سامنا کرنا ہوگا اور یوں ان پر پڑا پردہ ہٹانا ہوگا۔ یہ کام اس وقت چھوڑ دیا جائے گا کہ جب آدمی کے اندر کی حقیقت اور اصلیت واہو جائے، یعنی آدمی کی یہ خواہش کہ وہ جتنا ممکن ہو سکے، اپنی زندگی کو بامفہوم بنائے۔ اگر یہ سلسلہ نہ رکے تو پھر ایک کام باقی رہ جاتا ہے، اس کے مخفی محرک کو کھوجنا، یعنی اس کے لاشعور کی ضرورت کو کم کرنا اور انسان کی حیثیت سے جو کچھ اصل ہے، اس کی پذیرائی کرنا۔

Scanned by CamScanner

وکٹر فرینکل

حیات اور فلسفہ

وکٹر فرینکل ایک سائیکاٹرسٹ تھا جو چھبیس مارچ انیس سو پانچ میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی دلچسپی ہمیشہ سے طب میں رہی۔ وہ ابھی اسکول ہی میں تھا کہ اس نے نفسیات پڑھنا اور اپنے ہم جماعتوں کی کاؤنسلنگ شروع کر دی تھی۔ اس نے اس زمانے کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ سے بھی خط کتابت اور ملاقات کی۔

سگمنڈ فرائیڈ ایک ذہین طالب علم تھا، تاہم اس کی تمام تر توجہ نفسیات پر رہی۔ اس نے یونیورسٹی آف ویانا سے سائیکاٹری اور نیورولوجی کی تعلیم حاصل کی اور خاص موضوعِ تحقیق خودکشی اور مایوسی رہا۔

جرمنی میں یہودیوں پر بہت سختی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اُن چند یہودی معالجین میں تھا جنھیں روتھچلڈ ہسپتال کے نیورولوجی ڈپارٹمنٹ میں بہ طور سربراہ تعینات کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اسے والدین، بیوی اور بھائیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا اور دور دراز حراستی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ یہاں فرینکل کے والد اگلے چھے ماہ میں مر گئے، لیکن فرینکل اگلے تین برس مختلف مقامات پر حراست میں رہا۔ اس دوران اس کے ساتھ جو کچھ ظلم روا رکھے گئے، ایک محقق کی حیثیت سے وہ ان سب کا جائزہ اور مشاہدہ کرتا رہا۔ یوں، اس کے سامنے انسانی نفسیات کے کئی عمیق پہلو سامنے آئے جو یقیناً عمومی حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اس کے مشاہدات سے جو تاثرات سامنے آئے، وہ وکٹر فرینکل نے آزادی کے بعد اپنی کتاب Man`s Search for Meaning میں تحریر کیے ہیں۔ اس وقت

Scanned by CamScanner

آپ کے ہاتھوں میں کتاب ''امید زندگی ہے'' اسی کتاب کا آسان اُردو ترجمہ ہے۔

تین سال بعد جب فرینکل کو کیمپ سے آزادی ملی تو اسے پتا چلا کہ اس کے تمام قریبی رشتے دار مارے جا چکے ہیں، سوائے اس کی ایک بہن کے، جو آسٹریلیا منتقل ہو گئی تھی۔

اپنی تحقیق سے وکٹر فرینکل نے ایک اور تھیراپی وضع کی جسے اس نے ''لوگو تھیراپی'' کا نام دیا۔ لوگو تھیراپی کو نفسیات کی دنیا میں تیسرا مکتب فکر مانا جاتا ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے آدمی کی زندگی میں کتنے ہی بھیانک اور خوف ناک حالات کیوں ناں پیش آئیں، وہ اپنی روحانی قوت کو استعمال کرتے ہوئے ان حالات کی سنگینی سے خود کو بچا سکتا ہے۔ قوت کے ان عوامل میں سب سے اہم عامل ''امید'' ہے۔ فرینکل کے مطابق، اگر آدمی کا روحانی وجود مضبوط ہوگا تو باہر کے شدید حالات آدمی کو ہلاک نہیں کر سکتے، بلکہ وہ سخت سے سخت حالات سے نکلنے میں کامیاب ہوگا۔

وکٹر فرینکل کی یہ کتاب ''مینز سرچ فار میننگ'' صرف نفسیات کی کتاب نہیں، بیسویں صدی کی چنیدہ تحریک انگیز کتابوں (موٹیویشنل بکس) میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب آج بھی انتہائی دلچسپی اور توجہ سے پڑھی جا رہی ہے۔ مذکورہ کتاب کے علاوہ وکٹر فرینکل نے اپنی زندگی میں مزید انتالیس کتابیں لکھیں۔ وہ اپنے کام میں مگن دو ستمبر انیس سو ستانوے کو اس دنیا سے چلا گیا۔

اس کا یہ قول بہت ہی امید افزا اور ہر فرد کیلئے اہم ہے کہ...

''آدمی سے سب کچھ چھینا جا سکتا ہے، لیکن اس کی آزادی نہیں چھینی جا سکتی... یعنی کسی بھی قسم کے حالات میں وہ کس قسم کا رویہ منتخب کرے گا، کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔''

Scanned by CamScanner

انسان-زندگی اور موت

ہر منٹ تقریباً ڈھائی سو بچے پیدا ہوتے اور تقریباً پونے چار لاکھ انسان روزانہ دنیا میں آتے ہیں۔ اس دنیا میں جو انسان بھی آیا ہے، اسے اس دنیا سے جانا ضرور ہے۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ انسان روزانہ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ایک دن ہم بھی ان میں شامل ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس دنیا میں آنا اور پھر یہاں کچھ ایام گزار کر چلے جانا ہی سب کچھ ہے؟ کیا یہ نظام کائنات یوں ہی بنا دیا گیا؟ کیا آپ اور میں اس دنیا میں بے وجہ بھیج دیے گئے؟ انسانی نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان ہر دَور میں اس سوال کی کھوج میں رہا ہے۔ مسلمان ہونے کے ناتے چونکہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس نے ہماری رہ نمائی کیلئے قرآن جیسی عظیم الشان کتاب ہمیں عطا کی ہے، ہمیں درج بالا سوالات کا جواب بھی اس کتابِ عظیم سے ملتا ہے۔ اس حوالے سے ارشاد خداوندی ہے: ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' (سورۃ الذاریات، آیت 56)

انسانی زندگی کے مقصد کو درج ذیل آیت میں مزید واضح کیا گیا ہے:

''اسی نے زندگی اور موت کی تخلیق کی تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ (اللہ) زبردست (اور) بخشنے والا ہے۔'' (سورۃ الملک، آیت 2)

سورۃ الکہف میں ہے، ''جو چیز زمین پر ہے، ہم نے اسے زمین کیلئے آرائش بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔'' (سورۃ الکہف، آیت 7)

انسان کی منزل

ہماری زندگی ایک سفر کی مانند ہے۔ ہر لمحہ ہم آزمائش میں ہیں، جیسے کلاس روم میں بیٹھا اسٹوڈنٹ مسلسل امتحان میں ہوتا ہے۔ زندگی کا یہ سفر ہماری پیدائش سے اگرچہ شروع ہوا ہے، لیکن موت پر ختم نہیں ہوگا۔ اگر دنیا کی زندگی (خواہ کتنے ہی برس ہو) ایک شاہ راہ ہے تو موت کے بعد اگلی شاہ راہ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جیسے زندگی کا مقصد بتا دیا، اسی طرح یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس سفر کی منزل کیا ہوگی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''ہر سانس لینے والے کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تمہیں قیامت کے دن تمہارے اعمال کا

Scanned by CamScanner

پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ تو جو شخص جہنم کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ اپنی مراد کو پہنچا۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔'' (سورہ آل عمران، آیت 185)

گویا، انسان کی منزل اس دنیا کی آسائشیں اور مال و متاع نہیں، بلکہ جہنم ہے یا جنت ہے۔ لیکن انسان اپنی تمام توانائیاں اس دنیا کے حصول میں لگا رہا ہے، حالانکہ اللہ کے نزدیک اس دنیا کی حیثیت مرے ہوئے بکری کے بچے جتنی بھی نہیں۔ (صحیح مسلم؛ حدیث 7418)

انسان کا کردار

ہر فرد اپنے تئیں جنت اور جہنم کے راستے پر گامزن ہے۔ صحیح احادیث سے پتا چلتا ہے کہ انسان نے اس دنیا میں جیسا عمل کیا ہوگا، اس کی بنیاد پر جنت اور جہنم میں درجات ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کی زندگی میں انسان کا عمل یعنی کردار اور برتاؤ اس کی موت کے بعد کی زندگی میں جنت یا جہنم کا تعین کرے گا۔ نیک اور اچھے کردار والے کو جنت عطا کی جائے گی اور بدکردار و گناہ گار کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

جو شخص اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک اور رسول اللہ ﷺ کو اُس کا آخری نبی مانے اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور محمد ﷺ کی روشنی میں ہر چھوٹا بڑا عمل کرے، وہی اللہ تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہے، کیوں کہ وہاں کامیابی کا معیار اللہ کی رضا اور جنت میں داخلہ ہے۔

ہماری ذمے داری یہ ہے کہ اپنے عمل اور کردار کو سیرتِ نبویؐ کے سانچے میں بدلیں۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ اللہ نے نو کام کرنے کا حکم فرمایا: (1) ظاہر و باطن ہر حال میں اللہ سے ڈروں (2) غصے اور خوشی دونوں میں انصاف کی بات کہوں (3) غریبی اور امیری میں اعتدال پر قائم رہوں (4) جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں (5) جو مجھے محروم کرے، میں اسے دوں (6) جو مجھ پر ظلم کرے، میں اسے معاف کردوں (7) میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو (8) میرا بولنا ذکر الٰہی کا بولنا ہو (9) میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔ (نسائی؛ مسند احمد)

یہ حدیث اپنی زندگی رب العزت کے احکام کو نبویؐ کردار کے سانچے میں ڈھال کر گزارنے کا آسان فارمولا پیش کرتی ہے۔ اپنی زندگی میں ان نو باتوں پر عمل شروع کر دیجیے۔ اِن شاء اللہ، آپ کی موجودہ زندگی سیرت نبویؐ پر اور موت کے بعد کی زندگی جنت کی ہوگی۔

Scanned by CamScanner

اُمید زندگی ہے

وکٹر فرینکل/سید عرفان احمد

نئی سوچ

آفس نمبر 47، فرسٹ فلور، ہادیہ علیہ سنٹر، غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

Cell: 0300-8475843 / 0340-4235023

Scanned by CamScanner